بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

مِعراجُ النّبی صلی اللہ علیہ وسلم

سورۂ بنی اسرائیل کا آغاز اللہ ربّ العزت نے اپنی پاکی بیان کرتے ہوئے ایک ایسے محیر العقل واقعہ سے کیا ہے جو اس کی قدرتِ کاملہ اور عظیم شان کا اظہار ہے۔ یہ وہی واقعہ ہے جس کے لیے ''معراج'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور جس میں ربّ رحیم راتوں رات نبی مکرم ﷺ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گیا۔ قرآن حکیم میں آپؐ کے اس سفر کا اتنا ہی ذکر ہے' البتہ مستند احادیث اور سیرت کی کتابوں کے مطابق مسجد اقصیٰ اس عظیم الشان سفر کا پہلا پڑاؤ تھا' وہاں سے پھر آپؐ عالم بالا کی انتہائی بلندیوں تک پہنچے۔ یہ واقعہ حضور ﷺ کو پیش آیا تھا اس لیے اسے ''معراج النبی'' کہا جاتا ہے' اور چونکہ رات کے وقت پیش آیا اس لیے ہمارے ہاں شب معراج سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ کب پیش آیا؟ حالت بیداری میں یہ ایک جسمانی سفر تھا یا محض روحانی مکاشفہ تھا؟ پھر یہ کہ آیا آپؐ کو اللہ کا دیدار بھی نصیب ہوا' جو اس مقدس سفر کا کلائمکس تھا' یا ربّ اور اس کے محبوب بندے کے مابین قربت میں محض مکالمہ ہوا؟ ان تمام معاملات میں اختلاف ہمارے ہاں اسلاف سے چلا آتا ہے۔

کثیر اور معتبر روایات کے مطابق یہ واقعہ ہجرت سے ایک سال قبل پیش آیا۔ جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے کہ آپ ﷺ نے اسی جسم مبارک کے ساتھ اس مقدس سفر کو طے کیا یا یہ ایک روحانی مکاشفہ تھا؟ نقلی اور عقلی دونوں لحاظ سے یہ عقیدہ بڑی مضبوط بنیادیں رکھتا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ سفر بہ نفس نفیس اسی جسم مبارک کے ساتھ خود کیا۔ قرآن مجید کی جس آیت مبارکہ میں اس سفر کا ذکر ہے اس میں جس انداز میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور اس غیر معمولی واقعہ کا ذکر کیا ہے محض روحانی مشاہدے کے لیے ایسا ضروری نہیں تھا۔ پھر یہ کہ اگر یہ محض روحانی مشاہدہ ہوتا تو قریش مکہ کو اسے اتنا بڑا ایشو بنانے کی ضرورت کیوں پیش آتی؟ روحانی مشاہدے تو انبیاء کے علاوہ بزرگانِ دین اور صالحین کو بھی ہوتے ہیں۔ کیوں ابوجہل نے انتہائی حیرت سے صدیق اکبرؓ سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان راتوں رات ایسا طویل سفر کر سکے؟ اور صدیق اکبرؓ نے بھی اُس وقت اس حیرت ناک واقعہ کو سچ تسلیم کیا جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ دعویٰ محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو روبرو ان ہی سر کی آنکھوں سے دیکھنے کا معاملہ بھی خاصا متنازع ہے۔ حقیقت میں ایک مسلمان کو اس واقعہ کی ٹائمنگ یا اللہ تعالیٰ کو روبرو دیکھنے کے معاملات سے کہیں زیادہ اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ

وہ اس غیر معمولی اور عقل کو مات دینے والے سفر سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ‘ اس کی عظیم شان اور پاکیزگی کو ذہنی اور قلبی طور پر تسلیم کرتے ہوئے انتہائی مضبوط ایمان اور یقین کی حالت میں دل کی گہرائیوں سے اس کی حمد وثنا کرے۔ اس سفر سے حضورﷺ کو عین الیقین کی دولت سے نوازا گیا۔ اُمت مسلمہ اگر اس یقین اور ایمانی کیفیت کا عشر عشیر بھی حاصل کر لے تو کُل اُمت کا بیڑا پار ہو جائے اور وہ اس فلاحِ عظیم کو پالے جس کا قرآن حکیم بار بار ذکر کرتا ہے۔

معراج کا بہترین تحفہ نماز پنج وقتہ ہے۔ یہ ایک ایسا بیش قیمت تحفہ اور ایسی گراں قدر نعمت ہے کہ اس کی برکات اور فوائد نہ کوئی زبان بیان کر سکتی ہے اور نہ کوئی قلم تحریر کر سکتا ہے۔ نماز انسانیت کی معراج ہے‘ نماز اسلام اور کفر کا فرق ظاہر کرتی ہے۔ نبی اکرمﷺ نے نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے۔ نماز روح کی غذا ہے اور روحانی مراتب طے کرنے کا افضل ترین زینہ ہے۔ نماز اللہ اور بندے میں رشتہ جوڑنے کا اوّلین اور اہم ترین ذریعہ ہے۔ نماز کی روحانی افادیت پر تو ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں‘ البتہ نماز کے طبعی فوائد بھی ہیں جن کا دنیا بھر کے ڈاکٹر اعتراف کر چکے ہیں۔ غیر مسلم ڈاکٹروں نے دل کے خطرناک مریضوں کو جو ورزش تجویز کی ہے وہ نماز سے بہت مطابقت رکھتی ہے۔

معراج کے اس سفر میں اللہ ربّ العزت نے حضورﷺ کو سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات بطور تحفہ عطا فرمائیں۔ ان حوالوں سے معراج النبیؐ مسلمانوں کے لیے ایک عظیم نعمت ہے اور ان پر ایک ایسا عظیم احسان ہے جس کا شکر ادا کرنے کے لیے انسانی عمر انتہائی قلیل ہے۔ مسلمانوں کا دینی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ جس ذات شریف کے واسطہ سے انہیں یہ نعمت کبریٰ میسر آئی ہے اُس پر درود بھیجیں اور ہر وقت دعا کرتے رہیں کہ اللہ ربّ العزت انہیں مقامِ محمود عطا فرمائے اور روزِ قیامت ہمیں اُن کی شفاعت نصیب فرمائے اور اُن کے دست مبارک سے حوضِ کوثر کا مشروب نصیب فرمائے۔

آخر میں ہم مسلمانوں کے ایک رویہ کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کی نبی اکرمﷺ سے محبت وعقیدت یقیناً بے مثل اور قابل تعریف ہے‘ لیکن عملی طور پر حضورﷺ کے اُسوۂ مبارک پر چلنے میں ہم زبردست غفلت کا ارتکاب کر رہے ہیں‘ اور جہاں تک آپﷺ کی اس عظیم سنت کا تعلق ہے جو آپؐ نے منصب نبوت پر فائز ہونے سے لے کر آخری وقت تک ایک لحظہ کے لیے بھی ترک نہیں کی‘ یعنی دینِ حق کے قیام کے لیے زبانی تبلیغ اور عملی جدوجہد اس سے اُمت مسلمہ قریباً لاتعلق ہو چکی ہے۔ اور ہمیں یقین کامل ہے کہ آج اُمت مسلمہ کی ذلت ونکبت اور رسوائی صرف اور صرف اس سنت رسول کے ترک کرنے کی وجہ سے ہے۔ شب معراج کو بدعات میں مصروف ومشغول ہونے کی بجائے ہمیں عہد کرنا چاہیے کہ ہم سنت رسول کو دانتوں سے پکڑ لیں۔ اسی میں ہماری دُنیوی اور اُخروی نجات مضمر ہے۔ ○○

سُورۃُ النِّساء

تمہیدی کلمات

قرآن مجید میں مکی اور مدنی سورتوں کے جو گروپ ہیں ان میں سے پہلا گروپ پانچ سورتوں پر مشتمل ہے۔ اس گروپ میں مکی سورۃ صرف سورۃ الفاتحہ ہے‘ جو حجم میں بہت چھوٹی مگر معنی ومفہوم اور عظمت وفضیلت میں بہت بڑی ہے۔ اس کے بعد چار سورتیں مدنی ہیں: البقرۃ‘ النساء‘ آل عمران اور المائدۃ۔ یہ چار سورتیں دو دو سورتوں کے دو جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ پہلا جوڑا سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران کا ہے‘ اور انہیں خود رسول اللہ ﷺ نے ایک مشترک نام دیا ہے ’’الزَّھْرَاوَین‘‘۔ ان دو سورتوں میں جو مناسبتیں اور مشابہتیں ہیں وہ ترجمہ کے دوران تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے آتی رہی ہیں۔ ان میں نسبتِ زوجیت کس اعتبار سے ہے اور یہ ایک دوسرے کی تکمیل کس پہلو سے کرتی ہیں‘ یہ بات بھی سامنے آ چکی ہے۔

اب دو سورتیں سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ جوڑے کی شکل میں آ رہی ہیں۔ ان دو جوڑوں میں ایک نمایاں فرق (contrast) یہ نظر آئے گا کہ سابقہ دو سورتوں میں پہلے حروفِ مقطعات ہیں اور پھر دونوں میں قرآنِ مجید اور کتبِ سماویہ کی عظمت کا بیان ہے‘ جبکہ ان دونوں سورتوں میں اس طرح کی کوئی تمہیدی گفتگو نہیں ہے‘ بلکہ براہِ راست خطاب ہو رہا ہے۔ البتہ نسبتِ زوجیت کے اعتبار سے ان میں یہ فرق ہے کہ سورۃ النساء کے آغاز میں صیغۂ خطاب ’’یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ‘‘ (اے لوگو) ہے‘ یعنی خطاب عام ہے‘ اور سورۃ المائدہ کا آغاز ہوتا ہے ’’یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا‘‘ کے صیغے سے‘ یعنی وہاں خطاب خاص طور پر انسانوں میں سے اُن لوگوں سے ہے جو ایمان کے دعوے دار ہیں۔ باقی جس طرح سورۃ البقرۃ اور آل عمران نصفین میں منقسم ہیں اس طرح کا معاملہ ان دونوں سورتوں کا نہیں ہے۔

اپنے اسلوب کے اعتبار سے یہ دونوں سورتیں سورۃ البقرۃ کے نصفِ ثانی کے مشابہ ہیں۔یعنی چند مضامین کی لڑیاں چل رہی ہیں‘ لیکن ایک رسّی کی طرح آپس میں اس طرح بٹی ہوئی اور گتھی ہوئی ہیں کہ وہ لڑیاں مسلسل نہیں بلکہ کٹواں نظر آتی ہیں۔اگر آپ چار مختلف رنگوں کی لڑیوں کو آپس میں بٹ کر رسّی کی شکل دے دیں تو ان میں سے کوئی سا رنگ بھی مسلسل نظر نہیں آئے گا‘ بلکہ باری باری چاروں رنگ نظر آتے رہیں گے۔اب اگر آپ اس رسّی کو کھول دیں گے تو ہر ایک لڑی الگ ہو جائے گی اور چاروں رنگ الگ الگ نظر آئیں گے۔سورۃ البقرۃ کے نصفِ ثانی کے مضامین کے بارے میں میں نے بتایا تھا کہ یہ گویا چار لڑیاں ہیں‘ جن میں دو کا تعلق شریعت سے ہے اور دو کا جہاد فی سبیل اللہ سے۔شریعت کی دو لڑیوں میں سے ایک عبادات کی اور دوسری معاملات کی ہے‘ جبکہ جہاد فی سبیل اللہ کی لڑیوں میں سے ایک جہاد بالمال یعنی انفاق فی سبیل اللہ اور دوسری جہاد بالنفس کی آخری شکل یعنی قتال فی سبیل اللہ ہے۔

یہاں سورۃ النساء میں بھی آپ دیکھیں گے کہ تین لڑیاں اسی طرح آپس میں گتھی ہوئی ہیں اور ان کے رنگ کٹواں نظر آتے ہیں‘ لیکن اگر آپ ان سب کو علیحدہ علیحدہ کر لیں تو ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک الگ مضمون بن جائے گا۔یہ تین لڑیاں خطاب کے اعتبار سے ہیں۔ چنانچہ ایک لڑی تو وہ ہے جس میں خطاب اہل ایمان سے ہے‘ اور سورۃ البقرۃ کی طرح اس کے ذیل میں وہی چار چیزیں آ رہی ہیں: قتال‘ انفاق‘ احکامِ شریعت اور عبادات۔دوسری لڑی میں خطاب اہل کتاب سے ہے اور اس میں نصاریٰ اور یہود دونوں شامل ہیں۔پہلی دو سورتوں میں یہود و نصاریٰ کا معاملہ علیحدہ علیحدہ تھا‘ جبکہ اس سورۃ میں اہل کتاب کے ذیل میں یہ دونوں ملے جلے ہیں۔تیسری لڑی اس سورۂ مبارکہ کا وہ سب سے بڑا حصہ ہے جو منافقین سے خطاب پر مشتمل ہے‘ لیکن اکثر و بیشتر لوگ وہاں بات سمجھ نہیں پاتے۔اس لیے کہ صیغۂ خطاب وہاں بھی ’’یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا‘‘ ہوتا ہے۔واضح رہے کہ پورے قرآن میں کہیں بھی ’’یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ نَافَقُوْا‘‘ کے الفاظ نہیں آئے۔صیغۂ خطاب ’’یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ‘‘ بھی ہے‘ ’’یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا‘‘ بھی ہے اور ’’یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا‘‘ بھی‘ لیکن ’’یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ نَافَقُوْا‘‘ کہیں نہیں ہے۔ اس لیے کہ منافق بھی قانوناً تو مسلمان ہی ہوتے تھے۔تو اصل میں یہ پہچاننے کے لیے بڑی گہری نظر کی ضرورت ہے کہ کسی مقام پر ’’یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا‘‘ کے الفاظ میں روئے سخن مؤمنین صادقین

کی طرف ہے یا منافقین کی طرف۔ اگر یہ فرق نہ کیا جائے تو بعض مقامات پر بڑی غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ التوبۃ کا یہ مقام ملاحظہ کیجیے: ﴿''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَا لَكُمۡ اِذَا قِیۡلَ لَكُمُ انۡفِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اثَّاقَلۡتُمۡ اِلَی الۡاَرۡضِ ؕ﴾ (آیت ۳۸) ''اے اہل ایمان! تمہیں کیا ہو جاتا ہے جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ نکلو اللہ کی راہ میں تو تم زمین میں دھنسے جاتے ہو؟'' اس اندازِ تخاطب سے ایک عام سوءِ ظن پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید یہ عام مسلمانوں کا حال تھا۔ حالانکہ اس طرزِ عمل کا مظاہرہ مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ منافقین کی طرف سے ہوتا تھا اور وہاں یہ عام مسلمانوں کا نہیں، منافقین کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ روئے سخن منافقین ہی کی طرف ہے۔ مؤمنین صادقین تو ہر وقت کھلے دل سے مال و جان کی قربانی کے لیے آمادہ رہتے تھے۔ گویا ؎

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی!

تو اصل میں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کس آیت میں روئے سخن کس کی طرف ہے۔

منافقین سے خطاب کے اعتبار سے یہ سورۂ مبارکہ اہم ترین ہے۔ سورۃ البقرۃ میں تو کہیں لفظ نفاق آیا ہی نہیں۔ یہ حکمتِ خداوندی ہے کہ اس مرض کو پہلے چھپا کر رکھا اور اس کی صرف علامات بیان کر دیں کہ جو کوئی بھی اپنے اندر ان علامات کو دیکھے وہ متنبہ ہو جائے اور اپنے علاج کی طرف متوجہ ہو جائے۔ لیکن جو لوگ اس طرح متوجہ نہیں ہوتے تو معلوم ہوا کہ ان کو اب ذرا نمایاں کرنا ضروری ہے اور بات ذرا عریاں انداز سے کرنی پڑے گی۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ایک دو جگہ نفاق کا لفظ آ گیا۔ لیکن اب یہاں سورۃ النساء میں سب سے بڑا حصہ منافقین سے خطاب پر مشتمل ہے۔ میرا تجزیہ یہ ہے کہ اس سورت کی ۱۷۶ آیات میں سے ۵۵ آیات میں روئے سخن مؤمنین صادقین کی طرف ہے، صرف ۳۷ آیات میں اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے مشترک طور پر خطاب ہے، جبکہ ۸۴ آیات میں خطاب منافقین سے ہے۔ لیکن یاد رہے کہ جہاں بھی ان سے بات ہوگی ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا'' کے حوالے سے ہوگی۔ اس لیے کہ ایمان کے دعوے دار تو وہ بھی تھے۔ منافق وہی تو ہوتا ہے جو ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر حقیقت میں ایمان سے تہی دامن ہوتا ہے، چاہے وہ شعوری طور پر منافق ہو چاہے غیر شعوری طور پر۔

سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ کے مابین ایک فرق نوٹ کر لیجیے۔ انسانی تمدن میں سب سے بنیادی چیز معاشرہ ہے، اور معاشرے میں بنیادی اہمیت عورت اور مرد کے تعلق کو حاصل

ہے۔ دوسرے یہ کہ معاشرے میں کچھ کمزور طبقات ہوتے ہیں‘ جن کے حقوق کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ یہ مضمون آپ کو سورۃ النساء میں ملے گا۔ عائلی قوانین سورۃ البقرۃ میں تفصیل سے آ چکے ہیں۔ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ازدواج کا جو رشتہ جڑتا ہے جس سے پھر خاندان وجود میں آتا ہے‘ جو معاشرے کی بنیادی اکائی (unit) اور اس کی جڑ بنیاد ہے‘ اس سے متعلق تفصیلی ہدایات سورۃ البقرۃ میں آ چکی ہیں۔ سورۂ آلِ عمران اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں شریعت کے احکام نہیں ہیں‘ سوائے اس ایک حکم کے جو سود کے بارے میں آیا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ (آیت ۱۳۰) ۔لیکن اب یہاں سورۃ النساء میں تمدن کی معاشرتی سطح پر مزید ہدایات دی جا رہی ہیں۔ خاص طور پر اُس معاشرے کے جو دبے ہوئے اور پسے ہوئے طبقات تھے ان کی حریت و آزادی‘ ان کے بہتر مقام اور ان کے حقوق کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔

معاشرے میں جنس (sex) کا معاملہ بھی بہت اہم ہے۔ کسی معاشرے میں اگر جنسی معاملات پر قدغنیں نہ ہوں اور وہ جنسی فساد کا شکار ہو جائے تو وہاں تباہی پھیل جائے گی۔ اس ضمن میں ابتدائی احکام اس سورۃ میں آئے ہیں کہ ایک اسلامی معاشرے میں جنسی نظم و ضبط (sex-discipline) کیسے قائم کیا جائے اور جنسی بے راہ روی سے کیسے نمٹا جائے۔ تو اس طریقے سے تمدن کی بنیادی منزل پر گفتگو ہو رہی ہے۔ سورۃ المائدۃ میں تمدن کی بلند ترین منزل ریاست زیر بحث آئے گی اور اعلیٰ سطح پر عدالتی نظام کے لیے ہدایات دی جائیں گی کہ چوری‘ ڈاکہ وغیرہ کا سدّباب کیسے کیا جائے گا۔ اس ضمن میں حدود و تعزیرات بھی بیان کی جائیں گی۔ باقی سورۃ النساء کی طرح سورۃ المائدۃ میں بھی اہل کتاب سے فیصلہ کن خطاب ہے۔

میں نے آغاز میں عرض کیا تھا کہ پہلے گروپ کی ان چار مدنی سورتوں میں دو مضمون متوازی چلتے ہیں۔ پہلا مضمون شریعت اسلامی کا ہے اور سورۃ البقرۃ میں احکامِ شریعت کا ابتدائی خاکہ دے دیا گیا ہے‘ جبکہ شریعت کے تکمیلی احکام سورۃ المائدۃ میں ہیں۔ ان سورتوں میں دوسرا مضمون اہل کتاب سے خطاب ہے اور وہ بھی تدریجاً آگے بڑھتے ہوئے سورۃ المائدۃ میں اپنی تکمیلی صورت کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ اہل کتاب سے آخری اور فیصلہ کن باتیں سورۃ المائدۃ میں ملتی ہیں۔ ان تمہیدی کلمات کے بعد اب ہم اس سورۂ مبارکہ کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

آیات ۱ تا ۱۰

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا
زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ
وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝۱ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا
تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ
حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ
لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا
مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ
فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗـــــًٔا مَّرِيْۗـــــًٔا ۝۴ وَلَا تُؤْتُوا
السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ
وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ
اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا
اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ
بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ
حَسِيْبًا ۝۶ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ
نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ نَصِيْبًا
مَّفْرُوْضًا ۝۷ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ
فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۸ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ
خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝۹
اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ
وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰﴾

آیت ۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ ’’اے لوگو

اپنے اس رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا''

دیکھئے معاشرتی مسائل کے ضمن میں گفتگو اس بنیادی بات سے شروع کی گئی ہے کہ اپنے خالق و مالک کا تقویٰ اختیار کرو۔

﴿وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا﴾ ''اور اُسی سے اس کا جوڑا بنایا''

نوٹ کیجیے کہ یہاں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ ''اُس نے تمہیں ایک آدم سے پیدا کیا اور اُسی (آدم) سے اس کا جوڑا بنایا''، بلکہ ''نَفۡسٍ وَّاحِدَةٍ'' (ایک جان) کا لفظ ہے۔ گویا اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ عین آدمؑ ہی سے ان کا جوڑا بنایا گیا ہو' جیسا کہ بعض روایات سے بھی اشارہ ملتا ہے' اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ آدم کی نوع سے ان کا جوڑا بنایا گیا' جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے۔ اس لیے کہ نوع ایک ہے' جنسیں دو ہیں۔ انسان (Human beings) نوع (species) ایک ہے' لیکن اس کے اندر ہی سے جو جنسی تفریق (sexual differentiation) ہوئی ہے' اس کے حوالے سے اس کا جوڑا بنایا ہے۔

﴿وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً﴾ ''اور ان دونوں سے پھیلا دیے (زمین میں) کثیر تعداد میں مرد اور عورتیں۔''

''مِنۡهُمَا'' سے مراد یقیناً آدم و حوا ہیں۔ یعنی اگر آپ اس تمدنِ انسانی کا سراغ لگانے کے لیے پیچھے سے پیچھے جائیں گے تو آغاز میں ایک انسانی جوڑا (آدم و حوا) پائیں گے۔ اس رشتہ سے پوری نوعِ انسانی اس سطح پر جا کر رشتۂ اخوت میں منسلک ہو جاتی ہے۔ ایک تو سگے بہن بھائی ہیں۔ دادا دادی پر جا کر cousins کا حلقہ بن جاتا ہے۔ اس سے اوپر پڑ دادا پڑ دادی پر جا کر ایک اور وسیع حلقہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح چلتے جائیے تو معلوم ہوگا کہ پوری نوعِ انسانی بالآخر ایک جوڑے (آدم و حوا) کی اولاد ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ﴾ ''اور تقویٰ اختیار کرو اُس اللہ کا جس کا تم ایک دوسرے کو واسطہ دیتے ہو' اور رحمی رشتوں کا لحاظ رکھو۔''

تقویٰ کی تاکید ملاحظہ کیجیے کہ ایک ہی آیت میں دوسری مرتبہ پھر تقویٰ کا حکم ہے۔ فرمایا کہ اُس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جس کا تم ایک دوسرے کو واسطہ دیتے ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ فقیر بھی مانگتا ہے تو اللہ کے نام پر مانگتا ہے' اللہ کے واسطے مانگتا ہے' اور اکثر و بیشتر جو تمدنی معاملات ہوتے ہیں ان میں بھی اللہ کا واسطہ دیا جاتا ہے۔ گھریلو جھگڑوں کو جب نمٹایا جاتا ہے تو آخر کار

کہنا پڑتا ہے کہ اللہ کا نام مانو اور اپنی اس ضد سے باز آ جاؤ! تو جہاں آخری اپیل اللہ ہی کے حوالے سے کرنی ہے تو اگر اُس کا تقویٰ اختیار کرو تو یہ جھگڑے ہوں گے ہی نہیں۔ اُس نے اس معاشرے کے مختلف طبقات کے حقوق معین کر دیے ہیں' مثلاً مرد اور عورت کے حقوق' ربّ المال اور عامل کے حقوق' فرد اور اجتماعیت کے حقوق وغیرہ۔ اگر اللہ کے احکام کی پیروی کی جائے اور اس کے عائد کردہ حقوق وفرائض کی پابندی کی جائے تو جھگڑا نہیں ہوگا۔

مزید فرمایا کہ رحمی رشتوں کا لحاظ رکھو! جیسا کہ ابھی بتایا گیا کہ رحمی رشتوں کا اوّلین دائرہ بہن بھائی ہیں' جو اپنے والدین کی اولاد ہیں۔ پھر دادا دادی پر جا کر ایک بڑی تعداد پر مشتمل دوسرا دائرہ وجود میں آتا ہے۔ یہ رحمی رشتے ہیں۔ انہی رحمی رشتوں کو پھیلاتے جائیے تو کل بنی آدم اور کل بناتِ حوا سب ایک ہی نسل سے ہیں' ایک ہی باپ اور ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نگران ہے۔''

یہ تقویٰ کی روح ہے۔ اگر ہر وقت یہ خیال رہے کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے' میرا ہر عمل اُس کی نگاہ میں ہے' کوئی عمل اُس سے چھپا ہوا نہیں ہے تو انسان کا دل اللہ کے تقویٰ سے معمور ہو جائے گا۔ اگر یہ استحضار رہے کہ چاہے میں نے سب دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں اور پردے گرا دیے ہیں لیکن ایک آنکھ سے میں نہیں چھپ سکتا تو یہی تقویٰ ہے۔ اور اگر تقویٰ ہو گا تو پھر اللہ کے ہر حکم کی پابندی کی جائے گی۔

یہ حکمتِ نبوت ہے کہ اس آیت کو نبی اکرم ﷺ نے خطبۂ نکاح میں شامل فرمایا۔ نکاح کا موقع وہ ہوتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان رشتۂ ازدواج قائم ہو رہا ہے۔ یعنی آدم کا ایک بیٹا اور حوا کی ایک بیٹی پھر اسی رشتے میں منسلک ہو رہے ہیں جس میں آدم اور حوا تھے۔ جس طرح اُن دونوں سے نسل پھیلی ہے اسی طرح اب ان دونوں سے نسل آگے بڑھے گی۔ لیکن اس پورے معاشرتی معاملے میں' خاندانی معاملات میں' عائلی معاملات میں اللہ کا تقویٰ انتہائی اہم ہے۔ جیسے ہم نے سورۃ البقرۃ میں دیکھا کہ بار بار ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ کی تاکید فرمائی گئی۔ اس لیے کہ اگر تقویٰ نہیں ہوگا تو پھر خالی قانون مؤثر نہیں ہوگا۔ قانون کو تو تختۂ مشق بھی بنایا جا سکتا ہے کہ بظاہر قانون کا تقاضا پورا ہو رہا ہو لیکن اس کی روح بالکل ختم ہو کر رہ جائے۔ سورۃ البقرۃ میں اسی طرزِ عمل کے بارے میں فرمایا گیا کہ: ﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا﴾ (آیت ۲۳۱) ''اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بنالو''۔

آیت۲ ﴿وَاٰتُوا الۡیَتٰمٰۤی اَمۡوَالَهُمۡ﴾ ’’اور یتیموں کے مال ان کے حوالے کر دو‘‘

معاشرے کے دبے ہوئے طبقات میں سے یتیم ایک اہم طبقہ تھا۔ دورِ جاہلیت میں ان کے کوئی حقوق نہیں تھے اوران کے مال ہڑپ کر لیے جاتے تھے۔ وہ بہت کمزور تھے۔

﴿وَلَا تَتَبَدَّلُوا الۡخَبِیۡثَ بِالطَّیِّبِ﴾ ’’اور (اپنے) برے مال کو (ان کے) اچھے مال سے نہ بدلو‘‘

ایسا ہرگز نہ ہو کہ یتیموں کے مال میں سے اچھا اچھا لے لیا اور اپنا ردّی مال اس میں شامل کر دیا۔

﴿وَلَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَهُمۡ اِلٰۤی اَمۡوَالِکُمۡ﴾ ’’اور ان کے مال اپنے مالوں میں شامل کر کے ہڑپ نہ کرو۔‘‘

﴿اِنَّهٗ کَانَ حُوۡبًا کَبِیۡرًا ۲﴾ ’’یقیناً یہ بہت بڑا گناہ ہے۔‘‘

یتیموں کے بعض سر پرست جو تقویٰ اور خوفِ خدا سے تہی دامن ہوتے ہیں‘ اوّل تو ان کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں‘ اور اگر ایسا نہ بھی کریں تو ان کا اچھا مال خورد برد کر کے اپنا ردّی اور بے کار مال اس میں شامل کر دیتے ہیں اور اس طرح تعداد پوری کر دیتے ہیں۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا لیتے ہیں تا کہ اسے بآسانی ہڑپ کر سکیں۔ ان کو ایسے سب ہتھکنڈوں سے روک دیا گیا۔

آیت۳ ﴿وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی﴾ ’’اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچیوں کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے‘‘

﴿فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ ’’تو (انہیں اپنے نکاح میں نہ لاؤ بلکہ) جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کر لو دو دو‘ تین تین‘ چار چار تک۔‘‘

اس آیت میں ’’یَتَامٰی‘‘ سے مراد یتیم بچیاں اور خواتین ہیں۔ یتیم لڑکے تو عمر کی ایک خاص حد کو پہنچنے کے بعد اپنی آزاد مرضی سے زندگی گزار لیتے تھے‘ لیکن یتیم لڑکیوں کا معاملہ یہ ہوتا تھا کہ ان کے ولی اور سر پرست ان کے ساتھ نکاح بھی کر لیتے تھے۔ اس طرح یتیم لڑکیوں کے مال بھی ان کے قبضے میں آ جاتے تھے‘ اور یتیم لڑکیوں کے پیچھے ان کے حقوق کی نگہداشت

کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اگر ماں باپ ہوتے تو ظاہر ہے کہ وہ بچی کے حقوق کے بارے میں بھی کوئی بات کرتے ۔لہٰذا ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم ان کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر تم ان یتیم بچیوں سے نکاح مت کرو' بلکہ دوسری عورتیں جو تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو۔ اگر ضرورت ہو تو دو دو' تین تین' چار چار کی حد تک نکاح کر سکتے ہو' اس کی تمہیں اجازت ہے۔ لیکن تم یتیم بچیوں کے ولی بن کر ان کی شادیاں کہیں اور کرو تا کہ تم ان کے حقوق کے پاسبان بن کر کھڑے ہو سکو۔ ورنہ اگر تم نے ان کو اپنے گھروں میں ڈال لیا تو کون ہو گا جو ان کے حقوق کے بارے میں تم سے باز پرس کر سکے؟ ـــــ منکرین سنت اور منکرین حدیث نے اس آیت کی مختلف تعبیرات کی ہیں' جو یہاں بیان نہیں کی جا سکتیں۔ اس کا صحیح مفہوم یہی ہے جو سلف سے چلا آ رہا ہے اور جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ مزید برآں تعددِ ازدواج کے بارے میں یہی ایک آیت قرآن مجید میں ہے۔ اس آیت کی رو سے تعددِ ازدواج کو محدود کیا گیا ہے اور چار سے زائد بیویاں رکھنے کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔

﴿فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً﴾ ''لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے درمیان عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر بس کرو''

یہ جو ہم نے اجازت دی ہے کہ دو دو' تین تین' چار چار عورتوں سے نکاح کر لو' اس کی شرطِ لازم یہ ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل کرو۔ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ اس شرط کو پورا نہیں کر سکو گے اور ان میں برابری نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی شادی کرو' اس سے زائد نہیں۔ بیویوں کے مابین عدل وانصاف میں ہر اُس چیز کا اعتبار ہو گا جو شمار میں آ سکتی ہے۔ مثلاً ہر بیوی کے پاس جو وقت گزارا جائے اس میں مساوات ہونی چاہیے۔ نان نفقہ' زیورات' کپڑے اور دیگر مال و اسباب' غرضیکہ تمام مادّی چیزیں جو دیکھی بھالی جا سکتی ہیں ان میں انصاف اور عدل لازم ہے۔ البتہ دلی میلان اور رجحان جس پر انسان کو قابو نہیں ہوتا' اس میں گرفت نہیں ہے۔

﴿اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ﴾ ''یا وہ عورتیں جو تمہاری ملکِ یمین ہوں۔''

یعنی وہ عورتیں جو جنگوں میں گرفتار ہو کر آئیں اور حکومت کی طرف سے لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ وہ ایک علیحدہ معاملہ ہے اور ان کی تعداد پر کوئی تحدید نہیں ہے۔

﴿ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ﴿۳﴾ ﴾ ''یہ اس سے قریب تر ہے کہ تم ایک ہی طرف کو

نہ جھک پڑو۔''

کہ بس ایک ہی بیوی کی طرف میلان ہے اور' جیسا کہ آگے آئے گا' دوسری معلق ہو کر رہ گئی ہیں کہ نہ وہ شوہر والیاں ہیں اور نہ آزاد ہیں کہ کہیں اور نکاح کر لیں۔

آیت ۴ ﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ ''اور عورتوں کو ان کے مہر خوشدلی کے ساتھ دیا کرو۔''

عورتوں کے مہر تاوان سمجھ کر نہ دیا کرو' بلکہ فرض جانتے ہوئے ادا کیا کرو۔ صَدُقَاتٌ صِدَاقٌ کی جمع ہے' جبکہ صَدَقَةٌ کی جمع صَدَقَاتٌ آتی ہے۔

﴿فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا﴾ ''پھر اگر وہ خود اپنی رضامندی سے اس میں سے کوئی چیز تمہیں چھوڑ دیں''

تم نے جو مہر مقرر کیا تھا وہ انہیں ادا کر دیا' اب وہ تمہیں اس میں سے کوئی چیز ہدیہ کر رہی ہیں' تحفہ دے رہی ہیں تو کوئی حرج نہیں۔

﴿فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا ۝۴﴾ ''تو تم اس کو کھاؤ مزے سے خوشگواری سے۔''

تم اسے بے کھٹکے استعمال میں لا سکتے ہو' اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن یہ ہو ان کی مرضی سے' زبردستی اور جبر کر کے نہ لے لیا جائے۔

آیت ۵ ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا﴾ ''اور مت پکڑا دو نا سمجھوں کو اپنے وہ مال جن کو اللہ نے تمہارے گزران کا ذریعہ بنایا ہے''

معاشرے میں ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے جو نادانوں اور ناسمجھ لوگوں (سُفَهاء) پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں بچے بھی شامل ہیں جو ابھی سن شعور کو نہیں پہنچے۔ ایسے بچے اگر یتیم ہو جائیں تو وہ وراثت میں ملنے والے مال کو اللوں تللوں میں اڑا سکتے ہیں۔ لہٰذا یہاں ہدایت کی گئی ہے کہ ایسے مال کے بے جا استعمال کی معاشرتی سطح پر روک تھام ہونی چاہیے۔ یہ تصور ناقابل قبول ہے کہ میرا مال ہے' میں جیسے چاہوں خرچ کروں! چنانچہ اس مال کو ''اَمْوَالَكُمْ'' کہا گیا کہ یہ اصل میں معاشرے کی مشترک بہبود کے لیے ہے۔ اگرچہ انفرادی ملکیت ہے' لیکن پھر بھی اسے معاشرے کی مشترک بہبود میں خرچ ہونا چاہیے۔

﴿وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ﴾ ''ہاں انہیں اس میں سے کھلاتے اور پہناتے رہو''

﴿وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵﴾ ''اور ان سے بات کیا کرو اچھے انداز میں۔''

اسی اُصول کے تحت برطانوی دور کے ہندوستان میں Court of wards مقرر کر دیے جاتے تھے۔ اگر کوئی بڑا جاگیردار یا نواب فوت ہو جاتا اور یہ اندیشہ محسوس ہوتا کہ اس کا بیٹا آوارہ ہے اور وہ سب کچھ اڑا دے گا، ختم کر دے گا تو حکومت اس میراث کو اپنی حفاظت میں لے لیتی اور ورثاء کے لیے اس میں سے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیتی۔ باقی سب مال واسباب جمع رہتا تھا تا کہ یہ ان کی آئندہ نسل کے کام آ سکے۔

آیت ۶ ﴿وَابۡتَلُوا الۡیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ ۚ﴾ ''اور یتیموں کی جانچ پرکھ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔''

﴿فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا﴾ ''پھر اگر تم ان کے اندر سوجھ بوجھ پاؤ''

تم محسوس کرو کہ اب یہ باشعور ہو گئے ہیں، سمجھ دار ہو گئے ہیں۔

﴿فَادۡفَعُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ ۚ﴾ ''تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو۔''

﴿وَلَا تَاۡکُلُوۡهَاۤ اِسۡرَافًا وَّبِدَارًا اَنۡ یَّکۡبَرُوۡا ؕ﴾ ''اور تم اسے ہڑپ نہ کر جاؤ اسراف اور جلد بازی کر کے (اس ڈر سے) کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔''

ایسا نہ ہو کہ تم یتیموں کا مال ضرورت سے زیادہ اور جلد بازی میں خرچ کرنے لگو، اس خیال سے کہ بچے جوان ہو جائیں گے تو یہ مال ان کے حوالے کرنا ہے، لہٰذا اس سے پہلے پہلے ہم اس میں سے جتنا ہڑپ کر سکیں کر جائیں۔

﴿وَمَنۡ کَانَ غَنِیًّا فَلۡیَسۡتَعۡفِفۡ ۚ﴾ ''اور جو کوئی غنی ہو اس کو چاہیے کہ وہ پرہیز کرے۔''

یتیم کا ولی اگر خود غنی ہے، اللہ نے اس کو دے رکھا ہے، اس کے پاس کشائش ہے تو اسے یتیم کے مال میں سے کچھ بھی لینے کا حق نہیں ہے۔ پھر اسے یتیم کے مال سے بچتے رہنا چاہیے۔

﴿وَمَنۡ کَانَ فَقِیۡرًا فَلۡیَاۡکُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ﴾ ''اور جو کوئی محتاج ہو تو کھائے دستور کے مطابق۔''

اگر کوئی خود تنگ دست ہے، محتاج ہے اور وہ یتیم کی نگہداشت بھی کر رہا ہے، اس کا کچھ وقت بھی اس پر صرف ہو رہا ہے تو معروف طریقے سے اگر وہ یتیم کے مال میں سے کچھ کھا بھی لے تو کچھ حرج نہیں ہے۔ اسلام کی تعلیم بڑی فطری ہے، اس میں غیر فطری بندشیں نہیں ہیں جن پر عمل کرنا ناممکن ہو جائے۔

﴿فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَیۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ فَاَشۡهِدُوۡا عَلَیۡهِمۡ﴾ ''پھر جب تم ان کے مال ان کے حوالے کرو تو اس پر گواہ ٹھہرا لو۔''

ان کا مال و متاع گواہوں کی موجودگی میں ان کے حوالے کیا جائے کہ ان کی یہ یہ چیزیں آج تک میری تحویل میں تھیں' اب میں نے ان کے حوالے کر دیں۔

﴿وَ کَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیۡبًا ۝۶﴾ ''اور اللہ کافی ہے حساب لینے کے لیے۔''

یہ دنیا کا معاملہ ہے کہ اس کے لیے لکھت پڑھت اور شہادت ہے۔ باقی اصل حساب تو تمہیں اللہ کے ہاں جا کر دینا ہے۔

آیت ۷ ﴿لِلرِّجَالِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا تَرَکَ الۡوَالِدٰنِ وَ الۡاَقۡرَبُوۡنَ﴾ ''مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اس میں سے جو ترکہ چھوڑا ہو والدین نے اور رشتہ داروں نے''

﴿وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا تَرَکَ الۡوَالِدٰنِ وَ الۡاَقۡرَبُوۡنَ﴾ ''اور عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں سے جو ترکہ ہے والدین اور رشتہ داروں کا''

یہاں اب پہلی مرتبہ عورتوں کو وراثت کا حق دیا جا رہا ہے' ورنہ قبل از اسلام عرب معاشرے میں عورت کا کوئی حق وراثت نہیں تھا۔

﴿مِمَّا قَلَّ مِنۡهُ اَوۡ کَثُرَ ؕ﴾ ''چاہے وہ وراثت تھوڑی ہو یا زیادہ ہو۔''

اللہ تعالیٰ کا قانون اس پر ہر صورت میں پوری طرح نافذ ہونا چاہیے۔

﴿نَصِیۡبًا مَّفۡرُوۡضًا ۝۷﴾ ''یہ حصہ ہے (اللہ کی طرف سے) فرض کیا گیا۔''

آگے آپ دیکھیں گے کہ اس قانونِ وراثت کی کس طرح بار بار تاکید آ رہی ہے۔ ساتھ ہی آپ یہ بھی دیکھتے رہیں کہ ہمارے معاشرے کے اندر اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی کس طرح دھجیاں بکھرتی ہیں۔ خاص طور پر ہمارے شمالی علاقے میں ویسے تو نماز روزہ کا بہت اہتمام ہوتا ہے' لیکن وہاں کے لوگ بیٹیوں کو وراثت میں حصہ دینے کو کسی صورت تیار نہیں ہوتے' بلکہ اپنے رواج کی پیروی کرتے ہیں۔ شریعت کی کچھ چیزیں بہت اہم ہیں اور قرآن میں ان کا حکم انتہائی تاکید کے ساتھ آتا ہے۔

آیت ۸ ﴿وَ اِذَا حَضَرَ الۡقِسۡمَۃَ اُولُوا الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنُ﴾ ''اور جب حاضر ہوں تقسیم کے وقت قرابت دار اور یتیم اور محتاج''

جب وراثت کی تقسیم ہو رہی ہو تو اب اگر وہاں کچھ قرابت دار‘ کچھ یتیم اور کچھ محتاج بھی آ جائیں۔

﴿فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۸﴾ ’’تو انہیں بھی کچھ دے دلا دو اس میں سے اور ان سے معقول انداز میں بات کرو۔‘‘

وہ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت وراثت تقسیم ہو رہی ہے اور وہ بالکل محتاج ہیں‘ تو ان کے احساسِ محرومیت کا جو بھی مداوا ہو سکتا ہے کرو‘ اور ان سے بڑے اچھے انداز میں بات کرو۔ انہیں جھڑکو نہیں کہ ہماری وراثت تقسیم ہو رہی ہے اور یہاں تم کون آ گئے ہو؟

آیت ۹ ﴿وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ﴾ ’’اور ڈرتے رہنا چاہیے ان لوگوں کو کہ اگر انہوں نے بھی چھوڑے ہوتے اپنے پیچھے ناتواں بچے تو ان کے بارے میں انہیں کیسے کیسے اندیشے ہوتے۔‘‘

﴿فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ’’تو انہیں چاہیے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کریں‘‘

انہیں یہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ یتیم جو اس وقت آ گئے ہیں یہ بھی کسی کے بچے ہیں‘ جن کے سر پر باپ کا سایہ نہیں رہا۔ لہٰذا وہ ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھیں۔

﴿وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝۹﴾ ’’اور سیدھی سیدھی (حق پر مبنی) بات کریں۔‘‘

آیت ۱۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا﴾ ’’یقیناً وہ لوگ جو یتیموں کا مال ہڑپ کرتے ہیں ناحق‘‘

﴿اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا﴾ ’’وہ تو اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں۔‘‘

﴿وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰﴾ ’’اور وہ عنقریب بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے۔‘‘

اندر کی آگ تو وہ خود اپنے پیٹوں میں ڈال رہے ہیں اور وہ خود بھی سموچے دوزخ کی بھڑکتی آگ میں ڈال دیے جائیں گے۔ گویا ایک آگ ان کے اندر ہو گی اور ایک وسیع و عریض آگ ان کے باہر ہو گی۔ یہ دس آیتیں بڑی جامع ہیں‘ جن میں اس معاشرے کے پسماندہ طبقات میں سے ایک ایک کا خیال کر کے نہایت باریک بینی اور حکمت کے ساتھ احکام دیے گئے ہیں۔

آیات ۱۱ تا ۱۴

﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً
فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ
وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ
يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ
مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ ۚ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ
اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾ وَلَكُمْ
نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ
الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا
تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ
امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ
ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاۗءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ
مُضَاۗرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ
الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا
خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾﴾

سورۃ النساء کا دوسرا رکوع بڑا مختصر ہے اور اس میں صرف چار آیات ہیں‘ لیکن معنوی طور پر ان میں ایک قیامت مضمر ہے۔ یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے کہ چار آیتوں کے اندر اسلام کا پورا قانونِ وراثت بیان کر دیا گیا ہے جس پر پوری پوری جلدیں لکھی گئی ہیں۔ گویا جامعیت کی انتہا ہے۔

آیت ۱۱ ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ﴾ ”اللہ تعالیٰ تمہیں وصیت کرتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں“

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ﴾ ”کہ لڑکے کے لیے حصہ ہے دو لڑکیوں کے برابر۔“

﴿فَاِنۡ کُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَیۡنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ﴾ ’’پھر اگر لڑکیاں ہی ہوں (دویا) دو سے زیادہ تو ان کے لیے ترکے کا دو تہائی ہے۔‘‘

﴿وَاِنۡ كَانَتۡ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصۡفُ﴾ ’’اور اگر ایک ہی لڑکی ہے تو اس کے لیے آدھا ہے۔‘‘

ظاہر ہے اگر ایک ہی بیٹا ہے تو وہ پورے ترکے کا وارث ہو جائے گا۔ لہٰذا جب بیٹی کا حصہ بیٹے سے آدھا ہے تو اگر ایک ہی بیٹی ہے تو اسے آدھی وراثت ملے گی‘ آدھی دوسرے لوگوں کو جائے گی۔ وہ ایک علیحدہ معاملہ ہے۔

﴿وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ﴾ ’’اور میت کے والدین میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے جو اُس نے چھوڑا اگر میت کے اولاد ہو۔‘‘

اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کے والدین یا دونوں میں سے کوئی ایک زندہ ہو تو اس کی وراثت میں سے ان کا بھی معین حصہ ہے۔ اگر وفات پانے والا شخص صاحب اولاد ہے تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کے لیے وراثت میں چھٹا حصہ ہے۔ یعنی میت کے ترکے میں سے ایک تہائی والدین کو چلا جائے گا اور دو تہائی اولاد میں تقسیم ہوگا۔

﴿فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ﴾ ’’اور اگر اُس کے اولاد نہ ہو اور اُس کے وارث ماں باپ ہی ہوں تو اُس کی ماں کا ایک تہائی ہے۔‘‘

اگر کوئی شخص لاولد فوت ہو جائے تو اس کے ترکے میں سے اس کی ماں کو ایک تہائی اور باپ کو دو تہائی ملے گا۔ یعنی باپ کا حصہ ماں سے دوگنا ہو جائے گا۔

﴿فَاِنۡ كَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ﴾ ’’پھر اگر میت کے بہن بھائی ہوں تو اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے‘‘

اگر مرنے والا بے اولاد ہو لیکن اس کے بہن بھائی ہوں تو اس صورت میں ماں کا حصہ مزید کم ہو کر ایک تہائی کے بجائے چھٹا حصہ رہ جائے گا اور باقی باپ کو ملے گا‘ لیکن بہن بھائیوں کو کچھ نہ ملے گا۔ وہ باپ کی طرف سے وراثت کے حق دار ہوں گے۔ لیکن ساتھ ہی فرمادیا:

﴿مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ﴾ ’’بعد اس وصیت کی تعمیل کے جو وہ کر جائے یا بعد ادائے قرض کے۔‘‘

وراثت کی تقسیم سے پہلے دو کام کر لینے ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اگر اس شخص کے ذمے کوئی قرض ہے تو وہ ادا کیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ اگر اُس نے کوئی وصیت کی ہے تو اس کو پورا کیا جائے۔ پھر وراثت تقسیم ہوگی۔

﴿اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا﴾ ''تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے' تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمہارے لیے زیادہ نافع ہے۔''

﴿فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا فریضہ ہے۔''

تم اپنی عقلوں کو چھوڑ و اور اللہ کی طرف سے مقرر کردہ حصوں کے مطابق وراثت تقسیم کرو۔ کوئی آدمی یہ سمجھے کہ میرے بوڑھے والدین ہیں' میری وراثت میں خواہ مخواہ ان کے لیے حصہ کیوں رکھ دیا گیا ہے؟ یہ تو کھا پی چکے' زندگی گزار چکے' وراثت تو اب میری اولاد ہی کو ملنی چاہیے' تو یہ سوچ بالکل غلط ہے۔ تمہیں بس اللہ کا حکم ماننا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ⑪﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ علم وحکمت والا ہے۔''

اس کا کوئی حکم علم اور حکمت سے خالی نہیں ہے۔

آیت ۱۲ ﴿وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ﴾ ''اور تمہارا حصہ تمہاری بیویوں کے ترکے میں سے آدھا ہے اگر ان کے کوئی اولاد نہ ہو۔''

بیوی فوت ہوگئی ہے اور اس کے کوئی اولاد نہیں ہے تو جو وہ چھوڑ گئی ہے اس میں سے نصف شوہر کا ہو جائے گا۔ باقی جو نصف ہے وہ مرحومہ کے والدین اور بہن بھائیوں میں حسب قاعدہ تقسیم ہوگا۔

﴿فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ﴾ ''اور اگر اُن کے اولاد ہے تو تمہارے لیے چوتھائی ہے اس میں سے جو انہوں نے چھوڑا''

﴿مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ﴾ ''بعد اُس وصیت کی تعمیل کے جو وہ کر جائیں یا بعد ادائے قرض کے۔''

اگر مرنے والی نے اولاد چھوڑی ہو تو موجودہ شوہر کو مرحومہ کے مال سے ادائے دَین وانفاذِ وصیت کے بعد کل مال کا چوتھائی حصہ ملے گا اور باقی تین چوتھائی دوسرے ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ﴾ ''اور ان کے لیے

چوتھائی ہے تمہارے ترکے کا اگر تمہارے اولاد نہیں ہے۔''

﴿فَاِنۡ كَانَ لَكُمۡ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكۡتُمۡ﴾ ''اور اگر تمہارے اولاد ہے تو ان کے لیے آٹھواں حصہ ہے تمہارے ترکے میں سے''

﴿مِّنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ تُوۡصُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ﴾ ''اُس وصیت کی تعمیل کے بعد جو تم نے کی ہو یا قرض ادا کرنے کے بعد۔''

اگر مرنے والے نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تو ادائے دَین و انفاذِ وصیت کے بعد اس کی بیوی کو اُس کے ترکے کا چوتھائی ملے گا' اور اگر اُس نے کوئی اولاد چھوڑی ہے تو اس صورت میں بعد ادائے دَین و وصیت کے بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا۔ اگر بیوی ایک سے زائد ہے تو بھی مذکورہ حصہ سب بیویوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

﴿وَاِنۡ كَانَ رَجُلٌ يُّوۡرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امۡرَاَةٌ﴾ ''اور اگر کوئی شخص جس کی وراثت تقسیم ہو رہی ہے کلالہ ہو' یا عورت ہو ایسی ہی''

''کلالہ'' وہ مرد یا عورت ہے جس کے نہ تو والدین زندہ ہوں اور نہ اس کی کوئی اولاد ہو۔

﴿وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوۡ اُخۡتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ﴾ ''اور اُس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے۔''

﴿فَاِنۡ كَانُوۡۤا اَكۡثَرَ مِنۡ ذٰلِكَ فَهُمۡ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ﴾ ''اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے''

مفسرین کا اجماع ہے کہ یہاں کلالہ کی میراث کے حکم میں بھائی اور بہنوں سے مراد اَخیافی (ماں شریک) بھائی اور بہن ہیں۔ رہے عینی اور علاتی بھائی بہن تو ان کا حکم اسی سورت کے آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ عربوں میں دراصل تین قسم کے بہن بھائی ہوتے ہیں۔ ایک ''عینی'' جن کا باپ بھی مشترک ہو اور ماں بھی' جنہیں ہمارے ہاں ''حقیقی'' کہتے ہیں۔ دوسرے ''علاتی'' بہن بھائی' جن کا باپ ایک اور مائیں جدا ہوں۔ اہل عرب کے ہاں یہ بھی حقیقی بہن بھائی ہوتے ہیں اور ان کا حکم وہی ہے جو ''عینی'' بہن بھائیوں کا ہے۔ وہ انہیں ''سوتیلا'' نہیں سمجھتے۔ ان کے ہاں سوتیلا وہ کہلاتا ہے جو ایک ماں سے ہو لیکن اس کا باپ دوسرا ہو۔ یہ ''اَخیافی'' بہن بھائی کہلاتے ہیں۔ ایک شخص کی اولاد تھی' وہ فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی

بیوی نے دوسری شادی کر لی۔تو اب اس دوسرے خاوند سے جو اولاد ہے وہ پہلے خاوند کی اولاد کے اَخیافی بہن بھائی ہیں۔تو کلالہ کی میراث کے حکم میں یہاں اَخیافی بھائی بہن مراد ہیں۔

﴿مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ﴾ ''اس وصیت کی تعمیل کے بعد جو کی گئی یا ادائے قرض کے بعد''

یہ دوشرطیں بہرصورت باقی رہیں گی۔مرنے والے کے ذمے اگر کوئی قرض ہے تو پہلے وہ ادا کیا جائے گا' پھر اس کی وصیت کی تعمیل کی جائے گی' اس کے بعد میراث وارثوں میں تقسیم کی جائے گی۔

﴿غَيْرَ مُضَآرٍّ﴾ ''بغیر کسی کو ضرر پہنچائے۔''

یہ سارا کام ایسے ہونا چاہیے کہ کسی کو ضرر پہنچانے کی نیت نہ ہو۔

﴿وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''یہ تاکید ہے اللہ کی طرف سے۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا کمالِ حلم والا ہے۔''

اُس کے حلم اور بردباری پر دھوکہ نہ کھاؤ کہ وہ تمہیں پکڑ نہیں رہا ہے۔ع ''نہ جا اُس کے تحمل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اُس کی!'' اُس کی پکڑ جب آئے گی تو اس سے بچنا ممکن نہیں ہو گا:﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴿۱۲﴾﴾(البروج) ''یقیناً تمہارے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے''۔

آیت ۱۳ ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ ''یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود ہیں۔''

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ داخل کرے گا اسے ان باغات میں جس کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی''

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ''ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

﴿وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾﴾ ''اور یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔''

آیت ۱۴ ﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ﴾ ''اور جو کوئی نافرمانی کرے گا اللہ اور اس کے رسول کی اور تجاوز کرے گا اُس کی حدود سے''

﴿يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا﴾ ''وہ داخل کرے گا اس کو آگ میں جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔''

﴿وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾﴾ ''اور اس کے لیے اہانت آمیز عذاب ہوگا۔''oo

اسلام کا سیاسی نظام

اور جدید اسلامی ریاست

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کے ۲۲ ٔ ۸ اور ۲۹ مئی کے خطاباتِ جمعہ سے ماخوذ

بمقام قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن' لاہور

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ ؕ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ......﴾

(یوسف: ٤٠)

﴿وَّلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا﴾ (الکھف)

﴿وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ۠ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا ؕ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ؕ وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (النور)

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ①﴾ (الحجرات)

سوات امن معاہدہ میں انتہائی اہم کردار ادا کرنے والی مالاکنڈ کی معروف دینی شخصیت امیر تحریک نفاذِ شریعتِ محمدیؐ مولانا صوفی محمد صاحب نے کہا ہے کہ حکومت اور

اس کے زیر اثر چلنے والی عدالتیں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ وغیرہ کفریہ ادارے ہیں' جمہوریت کفر ہے' الیکشن میں حصہ لینا کفر میں تعاون ہے' جو کہ حرام ہے۔ انہوں نے بعض دینی قائدین کا نام لے کر یہ بھی کہا ہے کہ میں فلاں فلاں مذہبی لیڈروں کے پیچھے حکومت میں شرکت کرنے کی وجہ سے نماز نہیں پڑھتا۔ ان کے اس بیان پر آج کل بہت چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں جس سے بہت کنفیوژن پیدا ہو گیا ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ بعض حلقے یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان میں رائج جمہوری نظامِ حکومت عین اسلام ہے' جبکہ دوسری طرف یہ رائے بھی نہ صرف موجود ہے بلکہ بڑی شدّ و مد سے پیش کی جا رہی ہے کہ یہ نظام عین کفر ہے۔ اندریں حالات میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر مفصل بحث کی جائے' اور واضح کیا جائے کہ ان دونوں آراء کی حقیقت کیا ہے؟

انسانی حاکمیت شرک ہے

پہلی بات یہ ہے کہ قرآن انسانی حاکمیت (Peoples sovereignty) کی مطلق نفی کرتا ہے اور اس کے بجائے انسانی خلافت کا تصوّر پیش کرتا ہے۔ جیسا کہ تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا:

﴿اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَةً ؕ﴾ (البقرۃ: ۳۰)

''میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں''۔

انسان کو زمین کی خلافت ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اگر اللہ کے سوا حاکمیت کسی اور کے لیے تسلیم کی جائے تو یہ کفر اور شرک ہے' اور موجودہ دور کا سب سے بڑا شرک یہی ہے۔ لیکن اس کی طرف پوری توجہ نہیں دی جا رہی۔ تعجب اس امر پر ہے کہ وہ لوگ جو آج اپنے آپ کو سب سے بڑا موحد سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ عقیدۂ توحید و شرک کے حوالے سے ان کا موقف بہت عمدہ ہے' وہ بھی اس شرک کو شرک نہیں سمجھ پا رہے۔ عقیدے کے شرک تو انہیں خوب معلوم ہیں' مثلاً کسی غیر اللہ سے مدد مانگنا شرک ہے' قبر کو سجدہ کرنا شرک ہے' لیکن اس دور کے شرکِ اکبر کو وہ بھی پہچان نہیں پا رہے۔ دراصل اس دور میں شرک کی کئی نئی نئی صورتیں سامنے آئی ہیں' جن کو

پہچاننا ایک بندۂ مومن کے لیے لازم ہے' تب ہی وہ حقیقی موحد بن سکتا ہے ☆۔ بہرحال آج کے دور کا سب سے بڑا شرک عوامی یا انسانی حاکمیت کا تصور ہے۔ اسلام میں حاکمیت اعلیٰ اور اقتدارِ اعلیٰ کی مالک صرف اللہ کی ذات ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی بھی حاکمیتِ اعلیٰ کا حق دار نہیں ہے۔ سورۂ یوسف میں بڑے واضح الفاظ میں کہا گیا ہے:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (آیت ۴۰)

''حاکمیت اعلیٰ تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔''

حاکمیت اور خلافت میں فرق

مزید آگے بڑھنے سے پہلے حاکمیت اور خلافت میں فرق سمجھ لیجیے۔ حاکمیت سے مراد قانون سازی کا مطلق اختیار اور ہر معاملے میں آخری فیصلہ کا حق ہے۔ یہ اختیار جس ذات کے ہاتھ میں ہوگا وہی حاکم ہوگا۔ جبکہ خلافت ایک محدود حد تک نیابت کا نام ہے۔ یعنی کسی اور کے حاکمیت کے تحت اور اس کی ہدایت کے مطابق کسی عمل کا اختیار ہونا۔ خلیفہ وہ ہے جو کسی کی ملک میں اُس کے تفویض کردہ اختیارات اُس کی ہدایت کے مطابق استعمال کرے۔ نوعِ انسانی نے تمدّنی ارتقاء کا طویل سفر طے کیا ہے۔ اس ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسانی حاکمیت اور خلافت میں بھی ارتقاء ہوا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے آباء واَجداد غاروں میں رہتے تھے۔ کسی جگہ کوئی سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام نہیں تھا۔ اس کے بعد قبیلے بن گئے۔ قبائل میں اختیار قبیلے کے سردار کے پاس ہوتا تھا' اور سب کو اس کی بات ماننی پڑتی تھی' قبیلے کی ریت پر عمل کرنا پڑتا تھا۔ گویا جوں جوں انسان مہذب ہوا اور نظام تشکیل پاتے گئے' پابندیاں بڑھتی چلی گئیں۔ اس کے بعد جب ایک ہی جگہ چار پانچ قبیلے آ کر آباد ہوئے تو شہری ریاستیں (City States) وجود میں آ گئیں۔ چند قبیلوں کے ساتھ رہنے سے مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ ایک قبیلے کے دوسرے قبیلے کے ساتھ معاملات کیسے طے ہوں گے؟ اب یہاں سے دستور بننا شروع ہوئے' تاکہ

☆ شرک کی حقیقت اور اس کی اقسام سے واقفیت' اور دورِ حاضر کے شرک سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے محترم ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''حقیقت واقسامِ شرک'' کا مطالعہ کریں۔

آپس میں رہنے سہنے کے کچھ قواعد وضوابط اور معاملات کرنے کے اصول طے کیے جائیں۔ لیکن سب سے اہم سوال یہ تھا کہ یہ اصول کون طے کرے گا' کس کے پاس اختیار ہوگا' کس کی بات حرفِ آخر کے طور پر مانی جائے گی۔ یہ وہ دور ہے جب انسان بادشاہت کے تصور سے آشنا ہوا' یعنی انسانیت ایک سیڑھی آگے چڑھ گئی۔ چنانچہ دنیا میں سلطنتیں وجود میں آئیں اور بڑی بڑی بادشاہتیں قائم ہوئیں۔ گویا ابتدائی مراحل (primary stages) سے گزر کر انسان بادشاہت تک پہنچ گیا۔ بادشاہتیں دو طرح کی تھیں۔ ایک وہ جن میں بادشاہ اللہ کے خلیفہ کے طور پر مملکت کا نظام چلاتا' اور دوسری وہ تھی جس میں وہ حاکمیت اعلیٰ کا مدعی ہوتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں پہلی اسلامی بادشاہت تھی اور دوسری کافرانہ۔

اسلامی بادشاہت کی ایک مثال حضرت داؤد علیہ السلام کی حکومت ہے' جنہیں قرآن نے خلیفہ کہا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ﴾ (ص:۲۹) یعنی ''اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے''۔ بظاہر تو وہ ایک بادشاہ تھے' کیونکہ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سیدنا سلیمان علیہ السلام بادشاہ بنے اور بعد میں وہ سلطنت سیدنا سلیمانؑ کے دو بیٹوں میں تقسیم ہوگئی۔ گویا یہ خاندانی نظامِ حکومت تھا' جس میں باپ کے بعد بیٹا برسر اقتدار آ رہا تھا' لیکن یہ بادشاہت خلافت تھی۔ سیدنا داؤد علیہ السلام نبی تھے۔ وہ اختیارِ کلی اور حاکمیت اعلیٰ کے مدعی بن کر نہیں بیٹھ گئے تھے' بلکہ ہر لمحہ اللہ سے رہنمائی لے کر اس کے احکام کا نفاذ کر رہے تھے۔ یہی معاملہ ان کے بیٹے سیدنا سلیمان علیہ السلام کا تھا کہ وہ بھی وحی الٰہی کی روشنی میں امورِ سلطنت انجام دیتے رہے۔ تو گویا یہ ''اسلامی بادشاہت یا خلافت'' تھی۔ یہ لفظ ذہن نشین کر لیجیے تاکہ آئندہ بات سمجھ میں آسکے۔

اس کے برعکس نمرود اور فرعون کی بادشاہتیں کافرانہ بادشاہتیں تھیں' کیونکہ وہ حاکمیت اور خدائی حقوق کے دعوے دار تھے۔ یعنی ہم جو چاہیں کریں گے' لوگوں پر ہمارا حکم چلے گا۔ فرعون نے یہ دعویٰ کیا: ﴿یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَھٰذِہِ الْاَنْھٰرُ

تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِیۡ ۚ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۵۱﴾ (الزخرف) ’’لوگو! کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں ہے‘ اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آ تا؟‘‘ یعنی مصر کا مالک میں ہوں‘ آب پاشی کا نظام میرے زیرانتظام ہے‘ دریائے نیل پر میری حکومت ہے‘ میں جسے چاہوں پانی دوں اور جس کا چاہوں پانی بند کردوں‘ کیونکہ حکم میرا ہی چلے گا۔ فرعون کا یہ دعویٰ دعوائے حاکمیت ہے جو کفر اور شرک ہے۔ اور یہی دعویٰ نمرود کا تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے اللہ رب العزّت کا تعارف کرواتے ہوئے فرمایا: ﴿رَبِّیَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ﴾ ’’میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے‘‘ تو اس نے جواب دیا‘‘ ﴿اَنَا اُحۡیٖ وَاُمِیۡتُ﴾ ’’میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں‘‘ — جس کا ثبوت اُس کج فہم نے اس طرح دیا کہ جیل سے دو قیدی منگوائے‘ ایک کی گردن اڑادی اور دوسرے کو آزاد کر دیا۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِهَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ﴾ ’’اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے‘ تو اسے مغرب سے طلوع کر کے دکھا دے!‘‘ ﴿فَبُهِتَ الَّذِیۡ كَفَرَ﴾ ’’تو وہ کافر (نمرود) مبہوت ہو کر رہ گیا‘‘۔ (البقرۃ:۲۵۸) فرعون اور نمرود دونوں کی بادشاہتیں کافرانہ اور مشرکانہ تھیں‘ جبکہ سیدنا داوٗد اور سلیمان علیہما السلام کی بادشاہت ایک اسلامی بادشاہت تھی‘ کیونکہ وہ حکمِ الٰہی کے تحت چل رہی تھی‘ اور یہی اسلامی خلافت ہے۔

شخصی خلافت

سیدنا داوٗد اور سلیمان علیہما السلام کی خلافت شخصی خلافت تھی‘ اور شخصی خلافت کا سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک نبوت چلتی رہی۔ نبی اور رسول خلیفہ اور اسلامی بادشاہ بھی ہوا کرتے تھے۔ وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی راہنمائی میں حکومت چلاتے تھے۔ البتہ جن مسائل میں اللہ کا حکم موجود نہ ہوتا اسے اپنے اجتہاد سے انجام دیتے تھے‘ اور اگر اللہ کی طرف سے اس کی تصویب ہو جاتی تو وہ بھی بالآخر شریعت بن جاتا۔ خلافت کے تصور کو سمجھنے کے لیے ایک بہت عمدہ مثال ’’وائسرائے‘‘ کی ہے۔ آج سے تقریباً پینسٹھ ستر سال پہلے ہندوستان میں حکومت کی صورت حال یہ تھی کہ ہندوستان کا حاکم اور بادشاہ انگلستان

میں موجود بادشاہ یا ملکہ ہوتی تھی۔ یہاں کے انتظام و انصرام کے لیے دہلی میں اس کا وائسرائے ہوتا تھا۔ وائسرائے کا کام صرف برطانیہ سے آئے ہوئے قوانین کی تنفیذ کرنا تھا' اسے ان میں کسی ردّ و بدل کا اختیار حاصل نہ تھا' کیونکہ حاکمیت (sovereignty) صرف تاج برطانیہ کو حاصل تھی۔ البتہ جن امور میں انگلستان سے کوئی حکم نہیں آتا تھا ان میں کسی حد تک وائسرائے کو اپنی سمجھ بوجھ اور حالات کا جائزہ لیتے ہوئے فیصلے کا اختیار حاصل تھا۔ بالکل یہی معاملہ اسلامی بادشاہت یا خلافت کا تھا کہ حکم صرف اللہ ربّ العزت کا ہی چلتا تھا اور خلیفہ (وقت کا نبی) صرف اس کی تنفیذ کرتا تھا اور جن معاملات میں کوئی واضح شرعی حکم نہیں ہوتا تھا ان میں اپنے اجتہاد اور رائے سے کام لیتا تھا۔"

شخصی خلافت کے سلسلہ کی آخری کڑی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس تھی۔ آپ جہاں خاتم النبیین' سیدالانبیاء اور رحمۃٌ للعالمین تھے وہاں آپؐ مدینہ کی چھوٹی سی ریاست کے خلیفہ بھی تھے۔ آپؐ کو جو حکم اللہ ربّ العزت کی طرف سے ملتا اس کی تنفیذ فرما دیتے' اور جن معاملات میں باقاعدہ حکم الٰہی نہیں ہوتا تھا اُن میں اجتہاد اور غور و فکر کے ذریعے فیصلہ فرما دیتے' تو اللہ ربّ العزت کی خاموشی اسے شریعت کے درجے سے نواز دیتی ۔ آپؐ اسی حیثیت سے پہلے آٹھ سال مدینہ کی ایک چھوٹی سی ریاست پر فرماں روا رہے' لیکن ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو پورے عرب کی حکومت عطا فرما دی۔ "

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ صرف فتح مکہ سے ہی آپ ﷺ کو پورے عرب پر حکومت کیسے حاصل ہو گئی' جبکہ پورے عرب میں کوئی باقاعدہ حکومت تو تھی نہیں' جس کے صدر مقام کو فتح کرنے پر پورا عرب زیرنگیں آ گیا ہو؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ عرب میں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی لیکن پھر بھی مکہ مکرمہ کو تمام عرب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اسی لیے اسے اُمّ القریٰ کہا گیا ہے۔ ایک تو بیت اللہ یہاں تھا' اور دوسرے پورے عرب کے معبودانِ باطلہ (یعنی بت) مکہ میں موجود تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری قریش ادا کر رہے تھے۔ چنانچہ پورے عرب میں قریش کو عزت کی نگاہ سے

دیکھا جاتا تھا۔ان کے احترام کا یہ عالم تھا کہ پیشہ ور راہزن‘ لٹیرے اور ڈاکو بھی اُن کے تجارتی قافلوں کو پورا تحفظ دیتے تھے اور کوئی لوٹ مار نہیں کرتا تھا۔قریش پورے عرب میں معاشی سطح پر سب سے زیادہ مستحکم تھے۔لہٰذا مذہبی احترام اور معاشی استحکام کی وجہ سے گویا معنوی طور پر قریش پورے عرب پر حاکم تھے۔ چنانچہ جب مکہ فتح ہو گیا تو پورا عرب آپﷺ کی خلافت کے تابع ہو گیا اور آپؐ کو بالاتفاق خلیفہ مان لیا گیا۔

اجتماعی خلافت

نبوت و رسالت کا دروازہ بند ہو جانے کے بعد خلافت شخصی نہیں رہی‘ بلکہ اجتماعی خلافت میں ڈھل گئی۔اب خلافت کیسے چلے گی؟اس کا انداز کیا ہوگا؟اس مسئلہ کو قرآن کریم کی اس طویل آیت میں حل کیا گیا ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَـیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۪ وَلَـیُمَكِّنَنَّ لَهُمۡ دِیۡـنَهُمُ الَّذِی ارۡتَضٰى لَهُمۡ وَلَـیُـبَدِّلَـنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِكُوۡنَ بِیۡ شَیۡـئًا ؕ وَمَنۡ كَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۵۵﴾﴾ (النور)

’’اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے‘ اور اُن کے لیے اُن کے اُس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اُس نے اُن کے حق میں پسند کیا ہے‘ اور اُن کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا۔بس وہ میری بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔اور جو اِس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔‘‘

اس آیت سے خلافت کے بارے میں درج ذیل نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

(۱) سب سے پہلی بات جو عربی کی تھوڑی بہت سوجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے‘ یہ ہے کہ خلافت اب شخصی نہیں رہی‘ اجتماعی ہے۔سورۂ صٓ میں جہاں حضرت داوٗد علیہ السلام کو خلافت عطا کیے جانے کا ذکر ہے‘ وہاں اکیلے حضرت داوٗد کو مخاطب کیا گیا

ہے‘یعنی بات واحد کے صیغے میں کی گئی ہے:﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ﴾ ’’اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا‘‘—— اس کے برعکس یہاں بات جمع کے صیغے میں کہی گئی ۔فرمایا: ’’وہ لازماً انہیں (جو ایمان اور عمل صالح کے اوصاف کے حامل ہوں گے) خلافت عطا فرمائے گا‘‘۔اب خلیفہ مامور من اللہ نہیں ہوگا‘ بلکہ اسے مسلمان باہمی مشورے سے چنیں گے۔ اُس کے اختیارات مطلق نہیں ہوں گے کہ جو چاہے قانون سازی کرے‘ بلکہ وہ اللہ اور اُس کے رسولﷺ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر اپنی ذمہ داریاں ادا کرے گا۔ یہ خلافت عوامی خلافت نہیں ہوگی‘ بلکہ مسلمانوں کی خلافت ہوگی ۔کوئی کافر یا غیر مسلم اس میں شامل نہیں ہوگا۔

(۲) مسلمانوں سے خلافت کا وعدہ دو شرائط کے ساتھ ہے۔ایک ایمان اور دوسری عمل صالح۔ پھر یہ کہ جو لوگ ان شرائط کو پورا کریں گے‘ خلافت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ انہیں دو اور انعامات سے بھی نوازیں گے۔ایک یہ کہ اللہ اُن کے دین کو استحکام اور تمکن عطا فرمائے گا‘ دوسرے اہل ایمان کی حالت خوف کو حالتِ امن میں بدل دے گا۔ یہ حالتِ خوف کیا تھی ؟ یہ کہ مدینے کی چھوٹی سی بستی میں مسلمانوں کو ہر وقت یہ کھٹکا رہتا تھا کہ کہیں کوئی حملہ نہ کر دے‘ فلاں قبیلہ نہ چڑھ دوڑے‘ مکہ والے نہ چڑھائی کر دیں! غزوۂ احزاب کے وقت تو بالکل انتہا ہوگئی کہ پورے عرب میں ہر طرف سے مسلمانوں کے خلاف قافلے نکلے‘ جس کا نقشہ قرآن کریم نے یوں کھینچا ہے : ﴿اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ﴾ (الاحزاب: ۱۰) ’’جب تمہارے اُوپر سے (شمال کی جانب سے) بھی لوگ آئے اور تمہارے نیچے سے (جنوب کی طرف سے) بھی آئے ۔‘‘ کفار و مشرکین بارہ ہزار کا لشکر جرار لے کر مدینہ کی چھوٹی سی بستی پر حملہ آور ہوگئے تھے۔ جب اللہ کا دین غالب اور متمکن ہو جائے گا‘ مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے گی تو یہ بے یقینی اور خوف کی کیفیت بھی ختم ہو جائے گی۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے تین انعامات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اہل ایمان پورے طور پر اللہ تعالیٰ کی بندگی کریں گے اور پورے طور پر شرک سے پاک ہو جائیں گے۔یعنی اگر نظام

خلافت قائم نہیں تو آپ کی عبادت ناقص اور آپ کی بندگی ادھوری ہے۔ آپ نماز روزہ تو کر رہے ہیں لیکن یہ کافرانہ قانون کے سائے میں ہیں۔ آپ کا معاشی نظام سود اور بینکنگ پر مبنی چلا آ رہا ہے۔ تو جب تک اسلامی نظامِ خلافت قائم نہیں ہو جاتا ہماری عبادت ناقص اور جزوی رہے گی۔

(۴) اسلام کا غلبہ ہو جانے کے بعد بھی جو کفر کرے گا اور اس پر اَڑا رہے گا تو وہ نہایت ناہنجار ہے اور اس بدنصیب کے حصہ میں جہنم ہی ہے۔ اس لیے کہ جب باطل اور شر کا غلبہ تھا اُس وقت آپ مجبور تھے، دین پر عمل کرنا مشکل تھا، لیکن اب تو حالات سازگار ہیں، مواقع میسر ہیں، تو اب یہ طرزِ عمل بدبختی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ ایسے رویے کو کھلا نفاق بھی کہا گیا ہے۔

غیر اسلامی نظام کے تحت زندگی کا کفارہ

اِس وقت ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم غیر اسلامی نظام کے تحت زندگی گزار رہے ہیں اور یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اِس صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ دنیا میں کسی بھی جگہ اسلامی نظام قائم نہیں کہ وہاں ہجرت کر جائیں اور اس مجرمانہ زندگی سے چھٹکارا پا سکیں۔ جب کہیں اسلام کا نظام ہی موجود نہیں ہے تو ہم سود یا سود کا غبار کھانے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح ہمیں کئی اور ایسے گناہوں پر مجبور کر دیا گیا ہے جن کے خلاف ہمارا بس نہیں چلتا۔ ہم طوعاً و کرھاً ان میں شریک اور حصہ دار ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کا کوئی کفارہ بھی ہے جس کو ادا کر کے ہم اللہ کی جناب میں سرخرو ہو سکیں؟ تو میری نظر میں اس کا کفارہ یہ ہے کہ ہم اس طاغوتی نظام کے خاتمے اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے جدوجہد اور کوشش کریں۔ ہم ایسا کریں گے تو یہ غیر اسلامی نظام کے تحت زندگی گزارنے کے گناہ کا کفارہ اور تلافی ہو جائے گی۔ لیکن اگر ہم ایسا نہیں کرتے بلکہ غیر اسلامی نظام کو دل سے تسلیم کر رکھا ہے تو پھر ہم اللہ کے باغی ہیں۔ ہاں وہ لوگ کہ جو سارا سارا دن مزدوری کرتے ہیں، دو دو تین تین جگہ نوکریاں کرتے ہیں، تب جا کر بچوں کے پیٹ میں دو وقت چند لقمے ڈال سکتے ہیں وہ تو اس سے مستثنیٰ ہو سکتے ہیں، لیکن جن لوگوں کے لیے جدوجہد کرنا ممکن ہے، پھر بھی وہ

اس میں شریک نہیں ہوں گے تو وہ ﴿وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ کے مصداق ٹھہریں گے۔ اگر آج بش یہ کہہ سکتا ہے‘ جس کی حیثیت یہودیوں کے آلۂ کار کے سوا کچھ نہیں ہے‘ کہ ”You are with us or against us!“ یعنی ”تم ہمارے ساتھ ہو یا ہمارے دشمن ہو!“ تو اللہ بھی یہی کہتا ہے کہ اگر تم میرے ہو تو حزب اللہ میں شامل ہو جاؤ‘ ورنہ تم حزبُ الشیطان میں شمار ہو گے! یہی وجہ ہے کہ جب مکہ سے مدینہ ہجرت فرض کی گئی‘ تو جن لوگوں نے ہجرت نہیں کی انہیں منافق کہا گیا‘ سوائے ان کے جو کمزور‘ ناتواں‘ ضعیف تھے‘ راستے سے ناواقف تھے یا بے یار و مددگار خواتین اور بچے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا﴾ (الانفال:۷۲) ”جب تک وہ ہجرت نہ کریں تمہارا ان سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں“۔

بادشاہت اور جمہوریت میں قدرِ مشترک

اسلام نے شخصی خلافت سے اجتماعی خلافت تک کا جو سفر کیا ہے وہ آج سے چودہ سو سال پہلے مکمل ہو چکا تھا۔ یہ نظام خدائی حاکمیت پر مبنی ہے۔ اس کے برعکس انسانی حاکمیت پر مبنی بادشاہت نے تو محض تین سو برس پہلے جمہوریت کی طرف سفر شروع کیا۔ چونکہ جمہوریت بھی انسانی حاکمیت کے تصور پر اُستوار ہے‘ فرق صرف یہ ہے کہ کافرانہ بادشاہت میں اکیلا بادشاہ خدائی کا دعوے دار ہوتا تھا‘ جمہوریت میں حاکمیت تمام عوام کو سونپ دی گئی ہے‘ لہٰذا یہ وہی کافرانہ اور مشرکانہ نظام اور وہی فرعونیت اور نمرودیت ہے جو جدید شکل میں سامنے آئی ہے۔ اس کو یوں سمجھئے! فرض کیجیے‘ فرعون کے سر پر ٹنوں گندگی رکھی ہوئی تھی اور وہ اکیلا ہی اسے اٹھائے ہوئے تھا‘ تو اب جمہوریت نے اس گندگی کو سب لوگوں میں تولہ تولہ ماشہ ماشہ بانٹ دیا کہ تم بھی حاکم‘ وہ بھی حاکم‘ یہ بھی حاکم‘ سب حاکم۔ گویا نجاست جوں کی توں باقی ہے‘ البتہ اسے فردِ واحد کی بجائے کسی ملک کے تمام افراد پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔ بادشاہت کے بعد جو جمہوریت کا تصور آیا ہے علامہ اقبال نے اپنی نظم ”ابلیس کی مجلس شوریٰ میں“ اس کا بہت خوب نقشہ کھینچا ہے۔ بادشاہت کے خاتمے پر ابلیس کے ایک مشیر نے کہا کہ اب ہمارا کیا بنے گا‘ اب تو ابلیسیت ختم ہو گئی

ہے۔ اس پر ایک دوسرا مشیر گویا ہوا کہ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو‘ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے: ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر

یعنی ہم نے خود یہ لباس بدلا ہے‘ اور صرف لباس ہی بدلا ہے‘ اور کچھ تبدیل نہیں ہوا۔ وہی شاہی ہے‘ وہی انسانی حاکمیت ہے‘ جو پہلے ایک شخص کی تھی اب عوام اس کے مالک ہیں۔ واقعۃً کوئی فرق نہیں پڑا ہے‘ وہی شیطنت جوں کی توں ہے‘ کفر و شرک ویسے کا ویسا ہے۔ اس شعر کا دوسرا مصرعہ بہت اہم اور معنی خیز ہے کہ اب ابن آدم میں خود شناسی پیدا ہو گئی ہے‘ اُس میں یہ شعور پیدا ہو گیا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ ہم بھی آخر انسان ہیں! بادشاہ آسمان سے تو نہیں اترا‘ یا اسے سرخاب کے پر تو نہیں لگے ہوئے ہیں‘ پھر وہی کیوں ہم پر حکومت کرتا رہے؟

آزادی وخودشناسی محمد رسول اللہ ﷺ کی عطا ہے

اِب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ابن آدم کو خود شناسی اور خودنگری کس نے عطا کی ہے‘ اسے یہ سبق کس استاد نے پڑھایا ہے؟ دنیا میں اگر انسان کو آزادی اور خود شناسی کسی شخصیت نے عطا کی ہے تو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اَقدس ہے۔ اس کی مزید وضاحت کے لیے ذرا ایک واقعہ ملاحظہ کیجیے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں‘ حضور اکرم ﷺ کے ماموں ہیں‘ اور وہ دنیا کی واحد شخصیت ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ((فِدَاکَ اَبِیْ وَاُمِّیْ یَا سَعْدُ)) ”اے سعد‘ تجھ پر میرے ماں باپ قربان ہوں“۔ خلافت فاروقی میں جب ایران فتح ہوا اور آپؓ ایران کے گورنر بنے تو اپنے گھر کے باہر ایک ڈیوڑھی بنوا دی اور اس میں ایک دربان کھڑا کر دیا۔ یہ دیکھ کر پرچہ نویس نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس یہ لکھ کر بھیج دیا کہ سعدؓ نے اپنے گھر کے باہر ایک ڈیوڑھی بنوا کر اس میں دربان کھڑا کر دیا ہے‘ تاکہ کوئی ان سے براہِ راست نہ مل سکے۔ یہ بظاہر کوئی بہت بڑا معاملہ نہیں تھا۔ ایک تمدنی ضرورت

تھی۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص کسی دوسرے سے ہر وقت تو نہیں مل سکتا۔ ہر انسان کی کچھ اپنی ذاتی ضروریات وحاجات ہوتی ہیں جو دوسروں سے ملاقات میں مانع ہو سکتی ہیں۔ سورۃ النور میں صراحت ہے کہ اگر ایک آدمی دوسرے سے وقت لیے بغیر ملنے جاتا ہے تو وہ شخص اگر کسی اور مصروفیت کی بنا پر ملاقات نہیں کرتا تو ملنے کی نیت سے جانے والے کو اس کا برا نہیں ماننا چاہیے: ﴿وَاِذَا قِیْلَ لَکُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا﴾ (آیت ۲۸) ''اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو پھر لوٹ جاؤ''۔ لیکن دیکھئے' اسلام نے انسانیت کو کیا مقام دیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شکایت کے جواب میں حضرت سعد کو لکھا: ''اے سعد! لوگوں کو ان کی ماؤں نے آزاد پیدا کیا تھا' تو نے کب سے انہیں اپنا غلام بنا لیا ہے؟'' اور آپؓ نے ایلچی کو حکم دیا کہ وہ پہلے جا کر اس ڈیوڑھی کو آگ لگائے اور پھر یہ خط سعد کے حوالے کرے۔ حضور ﷺ کے فرمان ((سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ)) کو بعض کوتاہ نظر لوگوں نے ''اچھی شاعری'' کہا ہے کہ بھلا قوم کا سردار بھی کبھی خادم ہوا ہے؟ لیکن خلفاء راشدین کے طرزِ خلافت کو دیکھئے۔ انہوں نے سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ کی شاندار مثالیں عملاً قائم کر کے دکھا دیں۔

اسلام کی عطا کردہ آزادی اور مساوات کی ایک اور جھلک دیکھئے۔ فلسطین کے فتح ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ یروشلم کی چابیاں لینے جا رہے ہیں۔ اس سفر میں آپؓ نے مساوات کا جو معیار قائم کیا اس پر نوعِ انسانی تا قیامت رشک کرے گی۔ آپؓ کے ساتھ ایک غلام بھی ہے' ایک اونٹنی ہے' اس پر کچھ سامان بھی لادا ہوا ہے' جس کی وجہ سے اُس پر دو لوگ سواری نہیں کر سکتے۔ طے یہ ہوا کہ اونٹنی پر ظلم نہیں کیا جائے گا' لہٰذا ایک منزل عمرؓ سوار ہوں گے اور غلام نکیل پکڑ کر آگے آگے چلے گا اور ایک منزل غلام سوار ہو گا اور سیدنا عمرؓ نکیل پکڑ کر چلیں گے۔ میں کہتا ہوں اگر یہ دنیا دس بار فنا ہو کر دوبارہ پیدا ہو جائے تب بھی اس کی مثال نہیں لائی جا سکتی۔ تو یہ انسانی حریت' اخوت اور مساوات نوعِ انسانی کو کس نے دیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ صرف محمد ﷺ کی ذاتِ گرامی نے!

دیکھئے' جمہوریت پر جو سب سے پہلی کتاب آئی تھی وہ ''ری پبلک'' تھی' جو رسول

اللہ ﷺ کی بعثت سے ایک ہزار سال پہلے افلاطون نے لکھی تھی۔ یہ کتاب اس قدر اہم اور وزنی ہے کہ آج تک زندہ ہے‘ ورنہ اتنے عرصے میں کسی کتاب کا وجود تو کیا نام تک باقی نہیں رہتا۔ اس کتاب کی بدولت افلاطون کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ عقل و دانش میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ افلاطون نے اس کتاب میں جمہوریت کا محض ایک تصور پیش کیا تھا‘ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے جمہوریت بالفعل قائم کر کے دکھا دی۔ وہ اس طرح کہ خلافت میں کسی خاندان کی حکومت نہیں ہوتی‘ کوئی آمر اپنی طاقت کے بل بوتے پر مسلط نہیں ہوسکتا‘ بلکہ خلافت لوگوں کے مشورے سے قائم ہوتی ہے۔ یہی تو حقیقی جمہوریت ہے کہ عوام اپنی پسند کے مطابق کسی سربراہ حکومت کا انتخاب کریں۔ اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں‘ بلکہ پورے فخر سے کہتے ہیں کہ:

"First Republic Government in the world was established by Muhammad (S.A.W.S)"

اسی طرح کا معاملہ سوشلزم کا ہے۔ سوشلزم کا نظریہ ہے کہ ملکی وسائل اور دولت پر کسی خاص طبقے کی اجارہ داری نہ ہو‘ بلکہ تقسیم دولت کا ایک منصفانہ نظام ہو‘ جس سے سب یکساں طور پر مستفید ہوں۔ یہ نہ ہو کہ ایک طبقہ امیر سے امیر تر اور دوسرا طبقہ مفلس سے مفلس تر ہوتا چلا جائے۔ ملک کے وسائل میں سارے عوام برابر کے حصہ دار ہوں۔ ہاں تھوڑا بہت فرق ضرور ہوگا کہ کوئی شخص زیادہ محنت کر رہا ہے وہ یقیناً زیادہ کمائے گا‘ جو کم محنت کر رہا ہے اسے نفع کم ہوگا‘ کیونکہ بالکل سو فیصد برابری تو دنیا میں کبھی ہوئی ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ لیکن ہمارا دعویٰ ہے کہ سوشلزم جن مقاصد کو پورا کرنا چاہتا ہے وہ تمام مقاصد بھی سب سے پہلے خلافت نے پورے کیے ہیں۔ خلافتِ راشدہ کی شکل میں سب سے پہلے دنیا میں اسلامک سوشلسٹ سٹیٹ قائم ہوئی۔ کیونکہ سوشلزم کے بنیادی مقاصد دو ہیں:

(**۱**) دولت کا ارتکاز ایک خاص طبقے کے اندر نہ ہو جائے۔ اس بارے میں قرآن نے یہ اصول دیا ہے: ﴿**كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ**﴾(الحشر:۷) ’’تاکہ دولت تمہارے دولت مندوں ہی کے اندر گردش میں نہ رہے‘‘۔

(**۲**) ریاست ہر شہری کو بنیادی ضروریات مہیا کرنے کی ضمانت دے‘ ہر شخص کو گزر اوقات کے لیے بنیادی وسائل مہیا کرے۔ اس مقصد کو اسلام سے زیادہ کسی اور نے پورا نہیں کیا۔ انسان تو درکنار‘ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے دن عمر سے اس کی باز پرس ہوگی۔ غور کیجیے‘ جو سربراہِ حکومت کسی جانور کے بھوکا مرنے پر اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتا ہے‘ کیا اس کی حکومت میں کوئی انسان بھوکا مر سکتا ہے؟ یہ ہے خلافت کا اعلیٰ ترین نظام‘ جس میں یہ ضمانت دی گئی ہے کہ کوئی شخص بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہے۔ سکینڈے نیوین ممالک نے کیپٹل ازم اور سوشل ازم کو ملا کر ایک نیا نظام ترتیب دیا ہے جسے سوشل ڈیموکریسی کہا جاتا ہے۔ آپ وہاں کا ویلفیئر نظام دیکھئے تو پتا چلے گا کہ مساوات اس حد تک قائم ہے کہ جس سکول میں ملکہ کا بیٹا پڑھے گا‘ وہیں بھکاری کا بیٹا بھی تعلیم پائے گا۔ طبقاتی نظام نہیں ہے کہ امیر زادوں کے لیے اور سکول ہوں اور غریبوں کے لیے اور۔ امیروں کے بیٹے تو امریکہ اور یورپ میں جا کر پڑھیں اور عوامی سکولوں میں بچوں کے پاس بیٹھنے کے لیے ٹاٹ تک نہ ہوں۔ اسی طرح جس ہسپتال میں ملکہ کا علاج ہوگا وہیں پر ایک عام آدمی کا علاج بھی ہو گا۔ بالکل برابر‘ کوئی فرق نہیں۔ ہاں اتنا ضرور کیا گیا ہے کہ ملکہ صاحبہ کے لیے ہسپتال میں ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا ہے‘ تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں یہ نہ ہو کہ ہسپتال میں اسے کمرہ بھی نہ ملے‘ باقی علاج وہی ہوگا جو عام آدمی کا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں سوشلزم کا نعرہ تو بہت لگایا گیا ہے لیکن سب سے پہلے ان اصولوں کی بنیاد پر ریاست قائم کی ہے تو محمد عربیﷺ کی ذاتِ گرامی نے۔ دنیا میں آزادی اور مساوات کا عملاً کامل نمونہ آپؐ نے پیش کر کے دکھایا۔ دنیا کو یہ جمہوری نظام کس نے دیا؟ یہ محمد رسول اللہﷺ نے دیا ہے۔ لوگوں نے اس کے ساتھ کفر جوڑ دیا‘ اللہ کی حاکمیت کو عوامی حاکمیت میں بدل دیا‘ تو یہ اُن کی اپنی غلطی ہے‘ یہ اُن کا قصور ہے۔ باقی اصل تصور تو محمدﷺ کا دیا ہوا ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے اپنے ایک خطاب میں کہا تھا:

"The Republic System of Government is very close to Islam."

اقبال نے مارکسزم کے بارے میں بھی کہا ہے کہ وہ اسلام کے بہت قریب ہے۔ انہوں نے ایک بہت خوبصورت جملہ کہا ہے : *Marxism+God=Islam* یعنی مارکسزم نے جو نظام دیا تھا' اس میں خدا کو شامل کر دو تو اسلام بن جائے گا۔ جب اس سے خدا کو نکال دیا گیا تو وہ کفر اور شرک ہے۔

نوعِ انسانی کا بادشاہت سے جمہوریت تک کا سفر ایک بہت بڑی ترقی ہے۔لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ساری ترقیاں جناب نبی کریمﷺ ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ مثلاً آپ دیکھئے' امریکہ کے اندر ہر چار سال بعد الیکشن ہوتا ہے' جس کے نتیجے میں پہلا صدر اپنا عہدہ چھوڑ کر کرسیٔ صدارت پرامن طریقے سے نئے صدر کے سپرد کر دیتا ہے۔ وہاں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا' کسی قسم کا دنگا فساد برپا نہیں ہوتا۔تو یہ سب انسانیت کی کامیابیاں ہیں' ورنہ آٹھ دس برس تک حکومت کرنے کے بعد حکومت کو چھوڑنا یہ کوئی آسان بات ہے؟ لیکن انسانیت کو یہ سب ملی کہاں سے ہیں؟ یہ جناب نبی کریمﷺ ہی کی نوازشات میں سے ہیں۔ یہ روشنی نورِ مصطفیٰﷺ سے ہی مستعار لی گئی ہے اور اب بھی انسانیت ''تلاشِ مصطفیٰ'' میں سرگرداں ہیں' کیونکہ محمد عربیﷺ کی ہدایت کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جہاں تک انسانیت ابھی نہیں پہنچی اور ان پہلوؤں سے استفادہ نہیں کر پائی۔ یہی بات اقبال نے اپنے دو اشعار میں کہی ہے' جسے ہم پڑھتے ہیں لیکن اس کی گہرائی میں نہیں اُترتے۔علامہ کہتے ہیں:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیٰ اورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ است!

''یعنی دنیا میں تم جس جگہ بھی کوئی خیر و بھلائی دیکھو گے' کوئی اچھا رنگ دیکھو گے' اُلفت و محبت کی کوئی اچھی خوشبو محسوس کرو گے۔ ایسی خوبی جس کی خاک سے

انسانوں کی آرزوئیں اور اُمنگیں پروان چڑھتی ہیں، تو ایسی ہر خوبی یا تو محمد رسول اللہ ﷺ کے نور سے مستعار لی گئی ہے، یا اگر کہیں کوئی کمی ہے تو اس وجہ سے کہ ابھی انہیں وہ ہدایت ملی ہی نہیں ہے اور وہ نورِ مصطفی ﷺ کی تلاش میں ہیں۔"[2]

مغربی اصطلاحات کے استعمال کا مسئلہ

خلافتِ اسلامیہ کا دستوری خاکہ پیش کرنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ میں عموماً اپنی گفتگو میں جدید مغربی اصطلاحات مثلاً جمہوریت اور سوشلزم وغیرہ استعمال کرتا ہوں، خصوصاً جب بات اسلامی نظامِ حکومت کی ہوتی ہے۔ اس پر مجھے ایک انتہائی قابل احترام اور مخلص شخصیت کی طرف سے ایک طویل خط موصول ہوا ہے۔ یہ دوست ایک عرصے سے خلافت کے نظریات کی ترویج واشاعت کے لیے بڑی ہمت اور جانفشانی سے کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ آپ ان جدید مغربی اصطلاحات کو اسلام میں کیوں داخل کر رہے ہیں؟ اسلام جو ایک کامل نظام ہے، اس کی اپنی اصطلاحات ہیں، ہمیں کسی دوسرے سے کوئی چیز مستعار لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا ہم جب بھی اسلامی نظامِ حکومت کا تعارف کروائیں تو ہمیں انہی خالص اسلامی اصطلاحات ہی کو استعمال کرنا چاہیے۔ یقیناً ان کی بات بہت وزنی اور قابل قدر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ایک کامل نظام ہے، اس کی اپنی اصطلاحات ہیں، اور انہی کو اختیار کیا جانا چاہیے۔ اس لیے کہ کسی دوسری آئیڈیالوجی یا کسی دوسرے نظام کی اصطلاحات استعمال کرنے سے یہ نقصان ہوگا کہ ان اصطلاحات کا جو ایک غیر اسلامی تصور ہے وہ بھی عوام الناس کے ذہنوں میں آ جائے گا۔ تاہم دوسری طرف ایک بہت بڑی حقیقت یہ بھی ہے کہ جو اصطلاحات عام ہو جاتی ہیں لوگوں کے ذہنوں تک اِبلاغ ان کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ بامر مجبوری آپ کو رائج الوقت اصطلاحات کے حوالے سے بتانا پڑتا ہے کہ یہ ایسے نہیں بلکہ اس طرح ہے۔ مثلاً اہل مغرب کی جمہوریت یہ ہے، جو سراسر کفر ہے اور ہماری یہ ہے جو کفر نہیں، بلکہ اسلام ہے۔ لہٰذا ابلاغِ عامہ اور عوام کو سمجھانے کی غرض سے میں ان کا استعمال درست سمجھتا ہوں۔[3]

آپ غور کریں کہ آج کل علماء پر بہت بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان کی بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ سمجھ کیوں نہیں آتی؟ صرف اس لیے کہ وہ قدیم اصطلاحات میں بات کرتے ہیں اور عام پڑھا لکھا طبقہ ان اصطلاحات سے واقف نہیں ہے۔ ان اصطلاحات کے ذریعے علماء اپنے درمیان گفت وشنید کرلیں گے‘ لیکن عوام انہیں نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے ہمیں جدید اصطلاحات استعمال کرنی پڑتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے ہاں جمہوریت‘ اسلام اور سوشلزم کی جنگ جاری تھی۔ یہ اُس دور کی بات ہے جب ذوالفقار علی بھٹو ’’اسلامی سوشلزم‘‘ کے نعرے کے ساتھ میدان میں آئے تھے۔ اُس وقت دائیں بازو کی جماعتوں کی طرف سے ’’اسلامی جمہوریت‘‘ کی اصطلاح بکثرت استعمال کی جاتی تھی‘ لیکن یہ لوگ ’’اسلامی سوشلزم‘‘ کو کفر کہتے تھے۔ میں نے اُس وقت بھی کہا تھا کہ یا تو آپ اسلامی جمہوریت بھی کہنا چھوڑ دیں یا ’’اسلامی سوشلزم‘‘ کہنا بھی درست قرار دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی جمہوریت کی اصطلاح تو آج تک رائج ہے لیکن اسلامی سوشلزم کا کوئی نام نہیں لیتا۔ میرے نزدیک ان دونوں اصطلاحوں کا استعمال درست ہے۔

اسلامی ریاست میں دستور سازی کی حدود

اب میں آپ کو نظامِ خلافت کے دستوری خاکے کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ ابتداء میں سورۃ الحجرات کی جو پہلی آیت تلاوت کی گئی وہ اسلامی ریاست میں دستور سازی کے حوالے سے اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ دستور سازی کن حدود میں رہ کر کی جائے گی۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ①﴾

’’اے اہل ایمان! اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو‘ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔‘‘

اس آیت میں اسلامی ریاست میں قانون سازی (Legislation) کا بنیادی

تصوّر دے دیا گیا ہے۔ اسلامی ریاست میں قانون سازی اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولﷺ کی تعلیمات کے دائرہ کے اندر اندر ہوگی۔ کوئی بھی اس دائرے کو کسی صورت عبور نہیں کر سکتا۔ اس کی مزید وضاحت کے لیے اس حدیث پر غور کیجیے۔ حضرت ابوسعید الخذریؓ سے مسند احمد میں منقول ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَثَلُ الْمُؤْمِنِ کَمَثَلِ الْفَرَسِ عَلٰی آخِیَّتِہٖ ' یَجُوْلُ ثُمَّ یَرْجِعُ اِلٰی آخِیَّتِہٖ' وَاِنَّ الْمُؤْمِنَ یَسْھُوْ ثُمَّ یَرْجِعُ اِلَی الْاِیْمَانِ))

''مؤمن کی مثال اُس گھوڑے کی سی ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے' چلتا پھرتا ہے (اِدھر اُدھر جاتا ہے)' پھر کھونٹے کی طرف لوٹ آتا ہے۔ مؤمن بھی غافل ہو جاتا ہے' لیکن پھر ایمان کی طرف لوٹ آتا ہے''۔

دیکھئے! ایک گھوڑا وہ ہے جو بندھا ہوا نہیں' وہ جدھر چاہے گا جائے گا' جتنی دُور چاہے نکل جائے' حتیٰ کہ وہ بھاگ بھی سکتا ہے۔ لیکن وہ گھوڑا جسے آپ نے باندھ رکھا ہے وہ پابند ہو گیا ہے اور ایک دائرے کے اندر ہی حرکت کر سکتا ہے۔ بندۂ مؤمن بھی پابند ہے' آزاد نہیں ہے۔ اگر آپ اللہ کو مانتے ہیں تو اللہ کے احکام کی پابندی کرنا ہوگی۔ رسول اللہﷺ کو مانتے ہیں تو آپؐ کے فرمودات کا پابند ہونا پڑے گا۔ قرآن کو مانتے ہیں تو اس کی تعلیمات کو اپنانا ہوگا۔ اب اسی مثال کو میں ذرا وسعت دیتا ہوں۔ فرض کیجیے آپ چاہتے کہ گھوڑا بھاگے دوڑے' چلے پھرے' تاکہ کھڑے کھڑے اس کے اعضاء ڈھیلے نہ پڑ جائیں اور آپ اسے کھلے میدان میں ایک کھونٹے کے ساتھ دوسو گز لمبی رسی سے باندھ دیتے ہیں' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب گھوڑا دوسو گز کے اندر اندر شمال میں' جنوب میں' مشرق اور مغرب میں جا سکتا ہے لیکن دوسو ایک گز تک نہیں جا سکتا۔ اب اُسے آزادی بھی ہے اور ایک طرح سے پابندی بھی۔ اس دوسو گز نصف قطر کے دائرے کے اندر وہ آزاد ہے' جہاں تک چاہے چلا جائے' پچاس گز پر جا کر بیٹھ جائے' سو گز دُور چلا جائے' دوسو گز تک چلا جائے' لیکن اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ بالکل اسی حد تک اسلام میں جمہوریت کا تصور موجود ہے کہ کتاب وسنت کے احکام کے دائرہ میں رہ کر

آپ آزاد ہیں اور ہر طرح کی قانون سازی کر سکتے ہیں۔لیکن اسلام کے کھینچے ہوئے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔

ایک دفعہ میں اسلام آباد کمیونٹی سنٹر میں سورۃ الحجرات کا درس دے رہا تھا۔پہلی صف میں جسٹس محمد افضل چیمہ بیٹھے ہوئے تھے۔وہ اپنے زمانے میں بہت مشہور رہے ہیں اور چیف جسٹس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔میں نے اپنے درس میں اس آیت کے مفہوم کو خوب واضح کر کے بیان کیا۔بعد ازاں ایک ملاقات میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس آیت کو میں نے ہزار ہا مرتبہ پڑھا ہے' لیکن یہ تصور جو آپ نے دیا ہے کہ اس میں دستور کا پورا خاکہ موجود ہے' اس نے مجھے حیران کر دیا ہے' میں نے اس سے پہلے نہ تو کبھی ایسا سنا ہے' نہ کبھی اس طرح سوچا ہے' مجھ پر یہ بات پہلی مرتبہ کھلی ہے۔

ہمارے دستور میں جو یہ جملہ ہے:

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah."

یہ اسی آیت کی ترجمانی ہے۔ دستور میں اس آیت کی اس سے بہتر ترجمانی نہیں ہوسکتی' کہ یہاں قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نہیں بن سکتا۔ جو چیز قرآن وسنت کے منافی نہیں ہے اس میں آپ جو چاہیں قانون بنالیں۔قرآن وسنت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے جو بھی بہتر سے بہتر مشاورت کا نظام چاہیں وضع کریں' اس میں کوئی حرج نہیں۔اسی طرح آپ کو آزادی ہے کہ مختلف ادارے ترتیب دیں' تاکہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے بہتر انداز میں خدمات سرانجام دی جاسکیں۔یاد رہے جہاں اس سورۃ کی پہلی آیت نے دستوری حدود طے کر دی ہیں وہاں اسی سورۃ کے آخر میں یہ اصول بھی موجود ہے کہ اسلامی ریاست کی شہریت کیسے حاصل ہوگی۔ہر مسلمان اسلامی ریاست کا شہری قرار پائے گا جس نے اپنی زبان سے کلمہ طیبہ کا اقرار کیا ہو۔اب یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ واقعی یہ اس پر دل سے یقین بھی رکھتا ہے یا نہیں؟ یعنی اسلامی ریاست میں شہریت کی بنیاد اسلام ہے ایمان نہیں ہے۔

اس بات کو کھلے دل سے تسلیم کیا جانا چاہیے کہ اہل مغرب نے ادارہ جاتی حوالے

سے خاصی ترقی کی ہے۔ انہوں نے ہر کام کے لیے الگ الگ ادارے بنا دیے ہیں۔ مثلاً عدلیہ علیحدہ ادارہ ہے' انتظامیہ ایک علیحدہ ادارہ ہے۔ یہ ادارے ہم نے نہیں بنائے بلکہ مغرب نے بنائے ہیں۔ البتہ قرآن وسنت میں ہمیں اس کے اصول دے دیے گئے ہیں۔ نظامِ خلافت میں ان تمام چیزوں کی گنجائش موجود ہے جنہیں آج دنیا مانتی ہے۔ مثلاً ہر شخص کو اظہارِ رائے کی آزادی حاصل ہے۔ وہ جس طرح چاہے اس کا اظہار کرے۔ خواہ وہ جلسے کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرے یا اخباری بیان دے یا اس کے لیے کوئی اور ذریعہ اپنائے۔ البتہ اظہارِ رائے کی آزادی کی آڑ میں غیر مسلموں کو اس امر کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اسلام کے خلاف تبلیغ کریں' بیان دیں۔ کیونکہ خلافت ''عامۃ المسلمین'' کی ہے ''عامۃ الناس'' کی نہیں ہے۔ آپ خلیفہ کی کوتاہیوں کے حوالے سے حکومت پر تنقید کر سکتے ہیں' حکومت کی پالیسیوں سے اختلاف کر سکتے ہیں' یہ آپ کا حق ہے۔ اس طرح آپ کو جماعت سازی کی آزادی ہے۔ آپ جماعت بنائیں' یہ آپ کا حق ہے' البتہ ضروری ہے کہ آپ کے منشور (manifesto) میں کوئی خلافِ اسلام بات نہ ہو۔

مباحات کے دائرے میں آپ ترجیحات کا تعین کر سکتے ہیں۔ مثلاً ٹیکسیشن پالیسیز کا معاملہ ہے۔ اسی طرح مرکزی نظام پارلیمانی ہونا چاہیے یا صدارتی۔ قرآن نے ان میں سے کسی شے کو لازم کیا نہ حرام۔ آپ صوبائی نظام بھی بنا سکتے ہیں' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یونیٹری گورنمنٹ ہو' جس میں صوبے ہی نہیں ہوتے۔ جیسے بنگلہ دیش میں کوئی صوبہ نہیں ہے' بلکہ ایک ہی مرکزی حکومت ہے' جس کی ایک ہی اسمبلی ہے۔ صوبائی اسمبلیاں وہاں نہیں ہیں' حالانکہ ان کی آبادی ہم سے زیادہ ہے۔ اسی طرح ایران میں صوبائی گورنر تو ہوتے ہیں مگر صوبائی اسمبلیاں نہیں ہیں۔ یہ مباحات ہیں' ان میں سے جو نظام بھی آپ کے لیے زیادہ موزوں ہو آپ وہ نظام اختیار کر سکتے ہیں۔

قانون سازی میں اختلافِ رائے کا لائحہ عمل

مباحات کے دائرے میں قانون سازی عوام کی رائے سے ہوگی۔ اگر کسی کو اس

سے اختلاف ہے تو اس کو حق ہو گا کہ وہ عدالت میں جائے۔ اس ضمن میں سورۃ النساء کی دو آیات انتہائی اہم ہیں۔ ان آیات میں دو انسٹی ٹیوشنز کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾﴾

''اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں اُن کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ اللہ تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ سنتا اور دیکھتا ہے۔ مؤمنو! اللہ اور اُس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں اُن کی بھی۔ اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اُس میں اللہ اور اُس کے رسولؐ (کے حکم) کی طرف رجوع کرو۔ یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے''۔

ان آیات میں پہلی بات یہ فرمائی کہ ''اللہ تعالیٰ تمہیں امانتیں حق داروں کے حوالے کرنے کا حکم دیتا ہے''۔ حق رائے دہی بھی ایک بہت بڑی امانت ہے۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس قومی امانت کو ان کے اہل کے سپرد کریں۔ آپ جس شخص کو دیکھیں کہ متقی، صاحبِ علم وفکر اور صلاحیتوں کا مالک ہے اور اس ذمہ داری کا حق ادا کر سکتا ہے اسی کو ووٹ دیں۔ حدیث رسولؐ ہے: ((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ))(۱) ''جس سے مشورہ کیا جائے اسے امین بنا دیا جاتا ہے''۔ یعنی اگر آپ سے مشورہ مانگا گیا ہے کہ کون عوامی نمائندگی کی صحیح معنوں میں اہلیت رکھتا ہے تو آپ پابند ہیں کہ جسے سب سے بہتر سمجھتے ہیں اُس کے حق میں اپنی رائے دیں۔ ووٹ اللہ کی طرف سے امانت ہے، وہ اس کے اہل لوگوں کو دیا جانا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ فلاں امیدوار میری برادری کا ہے، وہ میرا کام کرا سکتا

(۱) سنن الترمذی، ابواب الادب، باب ان المستشار مؤتمن

ہے اور پولیس پرچے میں میری مدد کر سکتا ہے‘ لہٰذا میں اسے ووٹ دوں۔ یا اگر آپ پیسہ وغیرہ لے کر ووٹ دے رہے ہیں تو یہ اور بھی زیادہ غلط بات ہے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ: ﴿وَاِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ﴾ ’’جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے بیٹھو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو‘‘ —— یہ گویا عدلیہ کا ذکر آ گیا۔ یوں سمجھئے کہ جیسے آم کی گٹھلی میں پورا آم کا درخت ہے‘ ان دو آیات میں ایک اسلامی ریاست کا پورا سسٹم موجود ہے‘ کیونکہ ریاست کے بنیادی شعبے دو ہیں‘ ایک انتظامیہ اور دوسرا عدلیہ۔

عدلیہ کے بارے میں اصولی حکم دینے کے بعد اگلی آیت میں انتظامی ڈھانچہ بیان ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ﴾
’’اے اہل ایمان! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی‘ اور اُن کی جو تم میں سے اولی الامر (یعنی حکمران) ہیں‘‘۔

یہاں تینوں اطاعتوں میں ایک انتہائی باریک فرق رکھا گیا ہے۔ غور کیجیے‘ دو اطاعتیں (اللہ اور رسولؐ کی اطاعت) مطلق ہیں‘ جبکہ تیسری مشروط ہے۔ اسی لیے ’’اولی الامر‘‘ کے ساتھ لفظ ’’اَطِیۡعُوا‘‘ مذکور نہیں ہے۔ اور پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ ’’اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ‘‘ یعنی اولی الامر تمہیں میں سے ہوں‘ یعنی مسلمان ہو۔ پالیسی ساز اداروں میں کسی غیر مسلم کو نمائندگی نہیں دی جا سکتی۔ اولی الامر اگر شریعت کے مطابق حکم دیں تو اُن کی اطاعت بھی تم پر لازم ہے۔ لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اولی الامر کا فلاں فیصلہ شریعت کے خلاف ہے تو پھر حکم ہے کہ اس معاملے کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو‘ کیونکہ وہ مستقل اطاعتیں ہیں اور اولی الامر کی اطاعت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ اولی الامر چاہے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر لوگ ہی کیوں نہ ہوں‘ اگر وہ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں تو ان کی اطاعت ہو گی‘ ورنہ نہیں۔ اطاعتِ مطلقہ صرف اللہ اور رسولؐ کی ہے‘ باقی تمام امراء کی اطاعت شریعت کے دائرے میں رہ کر کی جائے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ جب عوام شریعت کے منافی کام ہوتا دیکھیں تو وہ آواز کس طرح اٹھائیں؟ یقیناً فیصلہ تو شریعت ہی کرے گی' لیکن یہ درخواست کہاں دی جائے گی کہ حاکم کا فلاں کام خلافِ شرع ہے۔ خلافت راشدہ میں علیحدہ علیحدہ طور پر ادارے تو موجود نہیں تھے' البتہ بنیادی اصول موجود تھے۔ آج اس کے لیے ادارے (institutions) بھی بنا دیے گئے ہیں۔ اِس وقت دنیا میں طاقتور ترین انسان امریکہ کا صدر ہے' لیکن اس کا بھی مواخذہ ہوسکتا ہے۔ ان کے دستور میں اس کا باقاعدہ طریقہ کار موجود ہے۔ اُس وقت باقاعدہ institutions موجود نہیں تھے' البتہ خلیفہ خود لوگوں کو یہ ہدایت کرتا تھا کہ دستورِ شریعت کی پیروی کے معاملے میں میرا محاسبہ کریں۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا: ''جب تک میں سیدھا رہوں تو تمہیں میری اطاعت کرنی ہوگی' اور اگر ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کرنا ہوگا''۔ اس پر ایک بدّو تلوار کھینچ کر کھڑا ہوگیا اور کہا کہ اگر ٹیڑھے ہو گئے تو ہم تمہیں اس سے ٹھیک کر دیں گے۔ حضرت عمرؓ نے اسے ڈانٹنے کے بجائے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرے پیچھے چلنے والے حیوانات یا بھیڑوں کا کوئی گلہ نہیں ہے بلکہ وہ لوگ ہیں جو آنکھیں کھول کر پوری بصیرت کے ساتھ چل رہے ہیں۔

اُس دَور میں اگر کسی معاملے میں اختلاف ہو جاتا' کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تو اس پر پوری بحث ہوتی اور صحابہ کرامؓ کی وقیع آراء کی روشنی میں اُسے حل کیا جاتا تھا۔ اسی طرح کا ایک مسئلہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پیش آیا تھا۔ جب عراق' ایران اور شام فتح ہوئے جو بہت زرخیز علاقے تھے تو ان کی زمینوں کی تقسیم کے بارے میں کچھ نزاع ہوگیا۔ مجاہدین نے کہا کہ یہ علاقے جہاد کے نتیجے میں حاصل ہوئے ہیں' اس لیے یہ مالِ غنیمت ہے اور مالِ غنیمت کی تقسیم کے اصول پر پانچواں حصہ بیت المال کو دے دیا جائے اور باقی اراضی مجاہدین کے مابین تقسیم کر دی جائے' جیسا کہ حضورﷺ نے خیبر کی زمینوں کے بارے میں کیا تھا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا ایسا نہیں ہے۔ مالِ غنیمت کا اطلاق صرف اس مال پر ہوتا ہے جو عین محاذِ جنگ پر ملے' جیسے ہتھیار' بھیڑیں' بکریاں'

اونٹ، گھوڑے وغیرہ، اس کے علاوہ وہ مرد اور عورتیں جو قید ہو جائیں ان مردوں کو غلام اور عورتوں کو آپ کنیزیں بنا سکتے ہیں۔ لیکن اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ پورے ایران، عراق اور شام کی عورتوں کو کنیزیں اور مردوں کو اپنے ذاتی غلام بنا لیں اور ان علاقوں کی زمینیں جاگیریں بن جائیں۔ بالفرض حضرت عمرؓ اس بات کو مان لیتے تو تاریخ انسانی کا عظیم ترین جاگیردارانہ نظام وجود میں آ جاتا، لیکن وہ اپنی رائے پر ڈٹ گئے۔ تاہم چونکہ بعض صحابہؓ نے آپؓ سے اس معاملے میں اختلاف کیا تھا، لہٰذا انہوں نے اس معاملے پر حتمی فیصلے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی، جس میں اوس اور خزرج کے پانچ پانچ آدمی ثالث بنا دیے، جو زمینداری کے شعبہ سے بخوبی واقف اور صاحب الرائے تھے۔ کمیٹی میں قریش کو شامل نہیں کیا گیا، اس لیے کہ وہ کاشت کاری کے پیشہ سے واقف نہیں تھے، وہ ''وادٍ غیر ذی زرع'' علاقے کے باشندے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس کمیٹی کے سامنے دو باتیں رکھیں۔ ایک یہ کہ اگر یہ زمینیں میں آج مجاہدین میں تقسیم کر دوں تو بعد میں آنے والے مسلمانوں کو کیا ملے گا؟ دوسرے اس وقت ہمیں اتنی بڑی سلطنت کی حفاظت کے لیے وہاں باقاعدہ فوج بٹھانی پڑے گی، اس کے اخراجات کہاں سے آئیں گے؟ کمیٹی نے کئی روز تک اس معاملے پر قرآن وسنت کی روشنی میں غور وخوض کیا اور پھر حضرت عمرؓ کے دلائل کو صحیح قرار دیتے ہوئے ان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے یہ قانون بنا دیا کہ جو ملک بھی بزورِ شمشیر فتح ہوگا اس کی زمینیں بیت المال کی ملکیت ہوں گی، جو خراجی زمینیں کہلائیں گی، اور جو لوگ بھی وہاں پر کام کریں گے، وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، وہ خراج دیں گے، اور خراج کے ذریعے سے جو آمدنی حاصل ہوگی اس سے سلطنت کی دفاعی اور دیگر ضروریات پوری ہوں گی۔

یاد رہے شریعتِ اسلامی میں زمین کی دو قسمیں ہیں: ایک خراجی زمینیں اور دوسری عشری۔ جو علاقے بغیر لڑے حاصل ہوں، یعنی وہ لوگ خود ہی ایمان لے آئیں تو ان کی زمینیں ان کی ملکیت میں رہیں گی، جیسے مدینہ کی زمینیں تھیں۔ یہ زمینیں عشری ہوں گی۔

انہیں کاشت کرنے والوں سے عشر لیا جائے گا' جیسے دیگر اموال میں مسلمانوں سے زکوٰۃ اور غیر مسلموں سے جزیہ لیا جاتا ہے۔ اس اصول کے تحت انڈونیشیا ملائشیا وغیرہ کی ساری زمینیں عشری ہیں' کیونکہ ان علاقوں کے لوگ عرب تاجروں کی تبلیغ سے خود بخود حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تھے۔ عرب لوگ صرف تجارت کی غرض سے ہی دوسرے ملکوں میں نہیں جاتے تھے' بلکہ وہ اسلام کے سفیر ہوتے تھے۔ یہ لوگ اعلیٰ کردار اور اخلاقیات کے مالک ہوتے تھے۔ اس لیے انہیں دیکھ کر اور ان کے اخلاق و کردار سے متأثر ہو کر دوسری قومیں مسلمان ہو جاتی تھیں۔

اس کے برعکس جو زمینیں کسی بھی وقت بزورِ شمشیر فتح ہوئی ہوں' وہ عشری نہیں ہیں' بلکہ خراجی ہیں۔ وہ بیت المال کی ملکیت ہوں گی۔ اس اصول کے تحت ہمارے ملک کی زمینیں خراجی ہیں' یہ کسی کی ملکیت نہیں۔ حضرت عمرؓ کے اس اجتہاد پر عمل کر کے ہم ملک سے جاگیرداری کے ظالمانہ نظام کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے دور میں یہ طے کیا گیا کہ یہ زمینیں انفرادی ملکیت نہیں بلکہ قومی ملکیت ہیں۔ کسی کو بھی کاشت کاری کا اجازت نامہ صرف بیت المال جاری کرے گا۔ اگر کسی شخص کو زمین الاٹ کی گئی ہے تو اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا خود بخود کاشت کار نہیں بن جائے گا' بلکہ اسے نیا فرمان لینا پڑے گا۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ مرنے والے کے ایک سے زائد بیٹے ہوں' ان میں سے صرف ایک کاشت کاری کرے اور باقی دوسرے کام کریں۔ تو جو کاشت کار ہو گا' وہی خراج دے گا۔

دورِ حاضر کے ریاستی ادارے

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ''اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ'' یہ دونوں اطاعتیں مستقل بالذات ہیں جبکہ ''اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ'' کی اطاعت مشروط ہے۔ اسی لیے اس کے ساتھ ''اَطِیۡعُوا'' کا لفظ نہیں لایا گیا' کیونکہ وہ مستقل بالذات اطاعت نہیں ہے۔ چنانچہ اگر اولی الامر سے کسی معاملے میں اختلافِ رائے ہو جائے تو یہ حکم ہے کہ اُس معاملے کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دیا جائے اور اس کے مطابق فیصلہ دے

دیا جائے‘ جس کی میں نے مثالیں عرض کی ہیں۔ اس کے لیے عدلیہ (Judiciary) کا ادارہ بااختیار ہونا چاہیے جو مقنّنہ (Legislature) اور انتظامیہ (Executive) پر نظر رکھے کہ اسلامی دستور کے خلاف تو کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے‘ یا جو قانون سازی ہو رہی ہے وہ کہیں اسلام سے متصادم تو نہیں ہے۔ آج کے دور میں تمدّنی ارتقاء کے نتیجے میں یہ تین ریاستی ادارے وجود میں آئے ہیں۔ ہمیں ان کو اختیار کرنا ہوگا۔ یہ درست ہے کہ یہ ادارے مغرب کی ایجاد ہیں‘ لیکن جیسے بجلی ہم نے ایجاد نہیں کی مگر ہم اسے استعمال کرتے ہیں‘ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ یہ انگریز کی ایجاد کردہ ہے۔ ہم لاؤڈ سپیکر استعمال کرتے ہیں‘ یہ بھی کسی مسلمان نے تو ایجاد نہیں کیا۔ اسی طرح ایئر کرافٹ غیر مسلموں کی ہی ایجاد ہے۔ تو جیسے ایئر کرافٹ مغرب نے بنایا ہے‘ ایسے ہی سٹیٹ کرافٹ (ریاستی نظام) بھی مذکورہ اداروں (institutions) کی شکل میں مغرب نے ہی develop کیا ہے‘ اگرچہ اصول محمد رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ جمہوریت بھی حضور ﷺ کی دی ہوئی ہے‘ سوشلزم حضور ﷺ کا اور خلافت راشدہ کا عطا کردہ نظام ہے۔ لیکن جب ہم جمہوریت کو اختیار کریں گے تو پہلے اسے مسلمان کریں گے۔ عوامی حاکمیت کے تصور کی بجائے اسے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کے اصول پر استوار کریں گے۔ اسی طرح سوشلزم کو اختیار کریں گے تو اسے پہلے اپنے اصولوں کے مطابق کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج دنیا نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ دنیا ابھی تک اس نظام تک نہیں پہنچ پائی جو نظام محمد ﷺ اور قرآن نے دیا تھا۔ آج کی دنیا سود کی حرمت کو نہیں پہنچ پائی‘ لہٰذا وہ سود اور جوئے کے نتائج خود دیکھ رہی ہے کہ کس طرح کیپیٹلزم کے چاروں ٹائر پنکچر ہو گئے ہیں۔ اس صورت حال نے اہل مغرب کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کوئی سیمی سوشلسٹ نظام اختیار کرنا پڑے گا۔ ان کا نظام اس قدر برباد ہو چکا ہے کہ اس کو بچانے کے لیے انہوں نے بینکوں کو کروڑوں اربوں ڈالر دیے ہیں کہ کسی طرح کیپیٹلزم بچ جائے۔ اسی طرح ہمارے بینک بھی بیٹھ رہے ہیں۔ اسی بینکنگ کے نظام پر تنقید کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا: ع ؎

ایں بنوک ایں فکر چالاکِ یہود
نورِ حق از سینہ آدم ربود
تا تہہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

یعنی ان بینکوں اور یہودی فکر نے انسان کے اندر جونور ملکوتی تھا ﴿نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ﴾ وہ نکال کر باہر پھینک دیا ہے۔ (اب انسان بھیڑیا‘ کتا یا سور بن کے رہ گیا ہے۔) جب تک یہ نظام تہہ و بالا نہ ہو جائے اُس وقت تک کہاں کی دانش‘ کہاں کی تہذیب اور کہاں کا دین؟ کچھ بھی نہیں ہے!‘‘

چنانچہ نوعِ انسانی کو سود اور جوئے پر مبنی اس نظام کو خیر باد کہہ کر بالآخر اسی نظام کو اختیار کرنا ہوگا جو محمد عربیﷺ نے عطا کیا تھا۔

خلافتِ راشدہ کے خصائص

موجودہ دور میں اسلامی نظامِ خلافت کی بنیاد تین چیزوں پر ہو گی: (i) اللہ کی حاکمیت (ii) قرآن وسنت کی بالادستی (iii) شورائیت یعنی جو معاملات مباحات کے درجے میں ہوں گے وہ باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔

اس ضمن میں ایک بات ضرور نوٹ کر لیں کہ رسول اللہﷺ کے بعد جو خلافت راشدہ قائم ہوئی تھی اس کے بعض خصائص ایسے ہیں جو دنیا میں دوبارہ repeat نہیں ہو سکتے۔ خلافت راشدہ دورِ نبوت کا ضمیمہ تھی‘ ان کے درمیان کوئی زمانی فصل نہیں تھا۔ آپؐ کا انتقال ہوتے ہی حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا آغاز ہو گیا۔ اس لیے اس دور کی واقعاتی صورت حال میں چند باتیں اچھی طرح ذہن میں ہونی چاہئیں:

(۱) نبی اکرمﷺ کی دعوت وتعلیم اور تربیت وتزکیہ کی وجہ سے بحیثیتِ مجموعی پورے ماحول پر خیر کا غلبہ تھا۔ یہ نہیں کہ شر تھا ہی نہیں‘ شر تھا ضرور‘ لیکن مغلوب اور دبا ہوا تھا۔ خاص طور پر وہ جماعت جو ہر وقت حضورﷺ کے بہت قریب رہتی تھی ان کے اندر تو خیر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپؐ اپنے صحابہؓ سے تمام معاملات میں مشاورت فرماتے

اور صحابہ کرامؓ بھی آپؐ کے حکم کے بغیر ایک قدم بھی نہ اٹھاتے تھے۔ آپؐ کا ان صحابہؓ سے تعلق اس قدر گہرا تھا کہ ایک دفعہ بعض لوگوں نے ان مقتدر صحابہ کے ساتھ گستاخی کا معاملہ کیا تو رسول اللہﷺ نے باقاعدہ خطبہ دیا اور اس میں فرمایا:

((لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ فَلَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ اَحَدِهِمْ وَلَا نَصِیْفَهٗ)) (۱)

''دیکھو! میرے صحابہ کو برا بھلا مت کہو' یقیناً تم میں سے کوئی شخص اللہ کی راہ میں کوہِ اُحد جتنا سونا صدقہ کرے تب بھی وہ ان میں سے کسی کے اللہ کی راہ میں دیے گئے ایک مُد بلکہ آدھے کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا''۔

غور طلب بات تو یہ ہے کہ اُس وقت آپ کے مخاطبین صحابہؓ ہی تھے' پھر بھی آپؐ نے فرمایا کہ میرے صحابہ کو گالی نہ دو۔ معلوم ہوا کہ ''اَصْحَابِی'' سے مراد آپؐ کی تیار کردہ خاص جماعت تھی' جو حزب اللہ کہلاتی تھی۔ (اس جماعت کے تفصیلی اوصاف سورۃ المائدۃ میں بیان ہوئے ہیں۔) یہ ایسی جماعت تھی جس کا تزکیہ اس درجے ہو چکا تھا کہ اس سے آگے تزکیہ کا تصوّر بھی ممکن نہیں تھا۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے، ایک جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک مشرک سے مقابلہ ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر غالب آ گئے اور پچھاڑ کر اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ آپؓ ابھی خنجر گھونپنے ہی والے تھے کہ نیچے پڑے ہوئے کافر نے اُن پر تھوک دیا۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ وہ شخص سخت حیران ہوا کہ میں تو مغلوب تھا' میرے سینے میں تو خنجر آیا چاہتا تھا' پھر میں نے ان کے چہرے پر تھوک کر ان کی توہین بھی کر دی' پھر یہ مجھے چھوڑ کر کھڑے کیوں ہو گئے؟ اُس نے حضرت علیؓ سے پوچھا: آپ نے ایسا کیوں کیا؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: دیکھو میرا تم سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے' میں تو تمہیں اللہ کے لیے قتل کر رہا تھا۔ اب جب تم نے میری توہین کی تو تمہاری اس حرکت سے میرے اندر ذاتی انتقام کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا۔ اب اگر میں تمہیں قتل کرتا تو یہ عمل خالصتاً لوجہ اللہ نہ ہوتا' بلکہ اس میں میرا جذبۂ انتقام بھی

(۱) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب قول النبیﷺ لو کنت متخذًا خلیلًا۔

شامل ہو جاتا‘ اس لیے میں نے تمہیں چھوڑ دیا۔ نبی کریمﷺ کے تربیت یافتہ صحابہؓ کے احتسابِ نفس کا اندازہ کیجیے کہ عین حالتِ جنگ میں بھی انہوں نے اپنی نیت پر کڑی خود احتسابی عائد کی ہوئی تھی ۔کیا اس کی کوئی ادنیٰ سی مثال بھی مل سکتی ہے؟ نیت کی پاکیزگی کا اس درجے لحاظ رکھنا، یہ صرف جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہی خاصہ تھا، جنہوں نے آپؐ سے تربیت پائی تھی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مخصوص جماعت کے افراد ورع وتقویٰ کے امام‘ عدل وانصاف کے پیکر‘ دُنیوی جاہ وجلال سے نفرت کرنے والے تھے‘اس لیے ان کی امانت ودیانت پر مکمل اعتماد کیا جاسکتا تھا۔خلفائے راشدین بھی چونکہ اسی گروہ کے افراد تھے اس لیے خلافتِ راشدہ میں ریاست کے تمام شعبوں مثلاً عدلیہ‘انتظامیہ‘ فوج وغیرہ پر انہیں مطلق اختیارات تفویض کرنا باعثِ ضرر نہیں تھا۔ چنانچہ ہمیں یہی دکھائی دیتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جو خلیفہ وقت ہیں‘ خود مجتہد بھی ہیں‘ قاضی بھی ہیں، حتیٰ کہ سپہ سالار بھی خود ہی ہیں۔آج ہمیں سیدنا ابوبکر‘سیدنا عمر‘سیدنا عثمان اور سیدنا علی رضی اللہ عنہم جیسی دیانت دار‘فہیم‘ مخلص اور اللہ سے ڈرنے والی شخصیات میسر نہیں ہیں۔لہٰذا اب جملہ اختیارات کسی ایک فرد کی ذات میں مرتکز نہیں کیے جاسکتے۔

(۲) خلفائے راشدین تاحیات خلیفہ ہوتے تھے۔یعنی ایک دفعہ جو صحابی خلیفہ منتخب ہو گئے تو وہ اپنی وفات تک کے لیے خلیفہ ہیں۔لیکن اب ایسے نہیں ہوگا‘ اس لیے کہ خلفاء راشدین کے بارے میں قطعاً یہ اندیشہ نہیں تھا کہ کسی وقت انہیں اقتدار کا نشہ چڑھ جائے اور وہ لوگوں پر ظلم‘ جبر‘ تشدد‘ زیادتی کرنے لگیں اور ناانصافی پر اتر آئیں۔آج لوگوں کے اخلاقیات اس قدر اعلیٰ اور کردار اس قدر پختہ کہاں ہیں کہ وہ سیم وزر کی چمک سے مرعوب نہ ہوں۔پولیٹیکل سائنس کا اصول ہے:

"Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely."

چنانچہ موجودہ دور میں حکومت کسی ایک فرد کے ہاتھ میں نہیں دی جائے گی۔یہی وجہ ہے کہ اس وقت دنیا کے جدید قانون میں Counstitutional Law ایک علیحدہ شعبہ

ہے جس میں سارا زور اسی پر ہوتا ہے کہ چیک اینڈ بیلنس رہنا چاہیے‘ یعنی اختیار کے اوپر بھی نگرانی ہو اور حاکم کے ذہن میں ہر وقت جواب دہی کا تصور موجود رہے۔ کیونکہ اگر کسی کے ہاتھ میں ایسا اختیار آ جائے جس پر نہ کوئی نگران ہو‘ نہ آدمی کو جواب دہی کی فکر ہو تو ایسا صاحب اختیار تو بدعنوان ہو جائے گا۔ یہ اصول خلفائے راشدین کے بارے میں نہیں ہے۔ لہٰذا جب انہیں ایک مرتبہ منتخب کیا گیا تو وہ پوری زندگی کے لیے خلیفہ بن گئے۔

(۳) اُس وقت ایک اور انتہائی اہم بات یہ بھی تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں قرآن اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدا کردہ درجہ بندیاں (gradations) بھی موجود تھیں۔ سب سے اوپر دس صحابہ یعنی عشرۂ مبشرہ تھے‘ پھر تین سو تیرہ اصحابِ بدر‘ پھر چودہ سو یا اٹھارہ سو اصحابِ بیعتِ رضوان‘ پھر فتح مکہ سے قبل ایمان لانے والے اور آخر میں وہ لوگ جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے۔ اس درجہ بندی کی بدولت اُمت کو فائدہ یہ ہوا کہ پہلے چاروں خلفاء اُمت کے دس بہترین لوگوں میں سے ہوئے۔ سب سے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے تو اپنے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فیصلہ دے دیا کہ میرے بعد یہ خلیفہ ہوں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی شہادت کے وقت کسی خاص شخص کے بارے میں فیصلہ نہ کر پائے کہ کس کو خلافت سونپی جائے۔ انہوں نے اس کام کے لیے ایک کمیٹی بنا دی۔ کمیٹی میں اپنے منتخب کردہ نہیں بلکہ اللہ اور رسول کے منتخب کردہ انہی عشرۂ مبشرہ میں سے صحابہؓ کو شامل کیا۔ یہ نہیں کہا کہ سارے قبیلوں میں سے ایک ایک آدمی لے آؤ‘ جیسے ایوب خان نے کیا تھا کہ ایک الیکٹورل کالج بنا لو‘ بعد میں وہ صدر منتخب کر دیں۔ اُس وقت عشرۂ مبشرہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ پانچ صحابہ رہ گئے تھے۔ آپؓ نے ان کی ایک باڈی بنا دی اور اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ان کی گفتگو اور مشاورت کی نگرانی کرو۔ ان میں سے دو افراد سیدنا زبیر اور سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ہم اس عہدے سے دستبردار ہوتے ہیں۔ اب باقی تین رہ گئے۔ ان میں سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے کہا کہ اگر آپ دونوں اپنا معاملہ میرے حوالے کر دو تو میں بھی آپ

کے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔ دونوں نے ان کی اس تجویز کو تسلیم کر لیا۔ باقی علیؓ اور عثمانؓ رہ گئے۔ اس سے یہ بھی پتا چلا کہ کسی عہدے کا امیدوار ہونا جائز ہے۔ اس لیے کہ جب تین صحابہؓ امیدواری سے دستبردار ہو گئے' تو جو رہ گئے وہ یقیناً امیدوار تھے' ورنہ وہ بھی دستبردار ہو جاتے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں حضرت یوسفؑ کے بارے میں مذکور ہے کہ انہوں نے خود کہا تھا: ﴿اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ﴾ (یوسف:۵۵) ''مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کر دو''۔ لہٰذا کسی خیر کے کام کے لیے آگے بڑھنا امیدواری نہیں بلکہ ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار ہے۔ بہرحال حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اہل حل وعقد سے تفصیلاً مشورہ کیا' اس کے علاوہ گلیوں میں کھیلتے بچوں سے اور خواتین سے بھی رائے لی اور بالآخر حضرت عثمانؓ کو منتخب کر دیا۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ صحابہ میں گریڈیشن تھی جو خود نبی کریمﷺ نے قائم کی تھی۔ ایسا معاملہ اب نہیں ہے۔ ایک شخص بڑا متقی نظر آ رہا ہے' لیکن اس کے اندر کیا ہے ہم نہیں جانتے۔ آیا اس کی خلوت اور جلوت ایک جیسی ہے' ہمیں علم نہیں ہے۔ البتہ خلفائے راشدین کے بارے میں نبی کریمﷺ کی سند موجود تھی۔

(۴) ایک بات اُس دور میں یہ تھی کہ معاشرہ قبائلی تھا' جس میں قبیلے کا سردار اپنے قبیلے کا نمائندہ ہوتا تھا۔ قبیلے کے ایک ایک فرد سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ قبائل کے سردار جمع ہو کر طے کر لیں تو ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ کا حق ادا ہو جاتا تھا۔ اب تمدّنی ارتقاء کے نتیجے میں سماج اس سطح تک آ پہنچا ہے کہ سیاسی عمل میں ہمیں تمام لوگوں سے رائے لینی ہو گی۔

مذکورہ چند چیزیں خلافتِ راشدہ کے خصائص ہیں' جو اب دوبارہ دنیا میں نہیں آ سکتے۔ البتہ خلافت کا جوہر باقی رہے گا کہ حاکمیت اللہ کی ہو گی' سپریم لاء قرآن اور سنت ہو گا اور اس کے نیچے نیچے مباح امور باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔''

استقرائی طرزِ استدلال اور جدید سوشل نظریات اسلام کی دین ہیں

عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ قرآن وسنت کے دائرہ کے اندر اندر جو کچھ بھی ہے، وہ مباح ہے۔ اسے میں نے پہلے ایک گھوڑے کی مثال کے ذریعہ سے سمجھانے کی کوشش کی ہے، مزید ایک اور اصول جان لیجیے کہ کسی شے کے حلال ہونے کے لیے قرآن وسنت سے دلیل لازمی نہیں ہے، البتہ کسی شے کے حرام ہونے کے لیے کتاب وسنت سے دلیل لازمی ہے، لہٰذا جو شے حرام نہ ثابت کی جا سکے وہ حلال ہے۔ آپ غور کیجیے کہ اس قاعدہ سے حلال کا دائرہ کتنا وسیع ہو گیا، لیکن اگر قاعدہ اس کے خلاف ہوتا کہ جو شے حلال ثابت نہ کی جا سکے وہ حرام ہے تو اس سے حرام کا دائرہ بہت وسیع اور حلال کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا۔ البتہ حلال کے دائرے کے اندر قرآن وسنت کی درجہ بندی موجود ہے۔ بعض اشیاء مستحب یعنی پسندیدہ ہیں اور بعض مباح یعنی جائز ہیں۔ لیکن اس حد تک یہ متفق علیہ ہے کہ جس شے کو کتاب وسنت کی رو سے حرام ثابت نہ کیا جا سکے وہ جائز ہے۔

اب یہ سمجھئے کہ مغرب کی اصل گمراہی کیا ہے؟ آج میں وہ بات کہنے لگا ہوں جو شاید بہت سے لوگوں کے لیے عجیب بھی ہو اور ناقابل قبول بھی۔ مغرب نے جو کچھ بنایا ہے، جو کچھ ایجاد کیا ہے، جو کچھ develop کیا ہے وہ سارے کا سارا حرام نہیں ہے۔ اس کو دوسرے انداز سے یوں سمجھئے کہ باطل محض کا دنیا میں وجود ہی نہیں ہے۔ باطل کسی نہ کسی حق کا سہارا لے کر اس کے گرد اپنا تانا بانا بنتا ہے۔ اس لیے کہ باطلِ محض کسی طرح قائم نہیں رہ سکتا۔ باطل کی مثال آکاس بیل کی ہے، جو خود قائم نہیں رہ سکتی بلکہ کسی اور درخت پر چڑھتی ہے اور پھر اُس کے سہارے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ باطل آکاس بیل کی طرح شجرِ حق پر چڑھتا ہے اور اُسے چوس لیتا یعنی غیر مؤثر کر دیتا ہے۔ سائنس کو مغرب نے develop کیا ہے تو کیا سائنس اور ٹیکنالوجی میں کوئی چیز حرام ہے؟ فزکس اور کیمسٹری میں کوئی چیز حرام ہو گی؟ نہیں! اسی طرح سائنس اور ٹیکنالوجی سے جو اسلحہ بنا وہ بھی حرام نہیں ہے۔ ہاں اگر اس کا استعمال غلط ہو رہا ہے تو یہ حرام ہو گا، لیکن فی نفسہٖ سائنس کی

ترقیاں حرام نہیں ہیں۔ جدید سائنس جتنی بھی develop ہوئی ہے‘ قرآن مجید کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ کیونکہ قرآن نے اس پوری کائنات میں پھیلی نشانیوں پر غور وفکر کی کھلی دعوت دی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾ ﴾ (البقرۃ)

’’جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں اُن کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں‘ رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں‘ اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے (دریاؤں اور) سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں‘ بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے‘ ہواؤں کی گردش میں‘ اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں‘ بے شمار نشانیاں ہیں۔‘‘

اللہ ربّ العزّت نے ان تمام مظاہر فطرت (phenomena of nature) کو اپنی نشانیاں قرار دیا اور یہ فرمایا کہ ان پر غور وفکر کرو‘ انہیں سمجھو‘ آیاتِ آفاقیہ‘ آیاتِ اَنفسیہ اور آیاتِ قرآنیہ میں ربط قائم کرنے کی کوشش کرو۔ اس سے تم پر علم ومعرفت کے خزانے کھل جائیں گے‘ جس سے صحیح علم وجود میں آئے گا۔

فلاسفہ اور سائنس دان ان نشانیوں پر دو طرح سے غور کرتے ہیں۔ ایک کا نام ہے منطق استخراجی اور دوسری منطق استقرائی۔ استخراجی منطق یہ ہے کہ کلیات وضع کر کے اُن سے جزئیات اخذ کیے جائیں۔ اس میں اس قدر گہرائی میں جا کر غور کیا جاتا ہے گویا بال کی کھال اتاری جا رہی ہے۔ یہ فلاسفہ کا طریق استدلال ہے۔ ارسطو کی یہی منطق تھی۔ منطق استقرائی میں جزئیات سے کلیات اخذ کیے جاتے ہیں۔ یہ سائنس کا طریق استدلال ہے۔ سائنس دان اپنے مشاہدے کو وسیع سے وسیع تر کر کے ایک جزئیہ

سے عمومی نتیجہ تک پہنچتے ہیں۔قرآن نے استقرائی منطق کی طرف دعوت دی ہے۔وہ کہتا ہے کہ تمہارے سامنے جو آیاتِ آفاقیہ‘ اَنفسیہ اور قرآنیہ ہیں‘ان پر غور کر کے نتائج اخذ کرو۔سائنس کو بنیادیں قرآن نے فراہم کیں۔ہم مسلمانوں ہی نے اس پر غور کرنے کا طریقہ (استقرائی طریق استدلال) سپین کی یونیورسٹیوں میں سکھلایا‘ جہاں سے یہ یورپ میں داخل ہوا۔لیکن پھر اسے پروان ہم نے نہیں بلکہ مغرب نے چڑھایا ہے۔بجلی کس نے ایجاد کی؟لاؤڈسپیکر کس نے بنایا؟ٹرینیں کس نے ایجاد کیں؟ہوائی جہاز کس نے ایجاد کیے؟ یہ سب مغرب نے ایجاد کیا ہے اور آج ہم بھی استعمال کر رہے ہیں۔ان میں سے کوئی چیز بھی حرام نہیں ہے۔ہاں ان کا استعمال غلط شروع ہو جائے تو یہ حرام ہو جائیں گی۔

انسانی حقوق سے متعلقہ جدید سوشل نظریات بھی اسلام نے ہی دیے ہیں۔مثلاً تہذیبِ جدید میں فرد کی آزادی کی بات کی جاتی ہے تو آزادی اسلام ہی کی مرہونِ منت ہے۔اسلام نے دنیا کو بتایا کہ اللہ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے‘ وہ کسی کا غلام نہیں ہے۔ مغرب کی اصل گمراہی یہ ہے کہ اس نے آزادی کو غلط رنگ دے دیا اور ایسے مادر پدر آزادی بنا دیا۔یعنی ہر شے سے آزادی‘ اللہ سے بھی آزادی‘ مذہب سے بھی آزادی‘ آسمانی ہدایت سے بھی آزادی۔خواتین کو حقوق اور انہیں اعلیٰ مقام بھی اسلام نے عطا کیا‘ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس نے مرد کو قوّامیت دی۔مغرب نے ہر معاملے میں عورت کو مرد کے بالکل برابر کر دیا۔نتیجہ کیا ہوا؟ خاندان ختم ہو گیا! ظاہر ہے کہ جب شوہر اور بیوی دونوں کا اختیار برابر ہے تو خاندان کا ادارہ کیسے چلے گا؟ ذرا سوچیے! کیا دنیا کا کوئی بھی ادارہ جس کے دو سربراہ ہوں چل سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا۔اگر آپ ادارے کو چلانا چاہتے ہیں تو اس کا ہیڈ ایک ہی رکھنا پڑے گا۔اگر آپ کی کوئی کاروباری کمپنی ہے تو ڈائریکٹر خواہ آپ سو رکھ لیں‘ اس کا مینیجنگ ڈائریکٹر ایک ہی رکھنا ہوگا۔اسی طرح ملک کا صدر ایک ہی ہوگا‘ دو تو نہیں ہو سکتے۔اسی طرح معاشی عدل وانصاف کا نظریہ بھی بنیادی طور پر اسلام نے ہی دیا۔قرآن مجید میں ہے: ﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر:۷) ’’تا کہ دولت صرف تمہارے اغنیاء کے مابین ہی نہ

گردش کرتی رہے''۔ البتہ اسلام نے اس ضمن میں ایک فطری معاشی نظام کی بنیاد رکھی جو معاشی توازن پر مبنی ہے' لیکن کمیونزم نے مساوات کا نعرہ لگا کر جو نظام تجویز کیا' وہ بالکل غیر فطری نظام تھا۔ بہرحال مغرب نے اسلام ہی سے روشنی حاصل کی۔ فکر جدید کا جو روشن پہلو ہے اس کی بنیاد محمد رسول اللہ ﷺ نے ہی رکھی ہے۔ یہی بات علامہ اقبال نے کہی ہے۔ ان کا بہت خوبصورت جملہ ہے:

The Inner core of the western civilization is Quranic.

یعنی ''موجودہ مغربی تہذیب کا جوہر قرآن ہے''۔ آزادی اور مساوات وغیرہ تو اسلام کی دی ہوئی ہے۔ اس پر مغرب نے غلط غلاف چڑھا دیے اور اسے غلط رخ دے دیے۔ بلکہ زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو ان فطری نظاموں کو غلط رخ دینے والا پورا مغرب نہیں ہے بلکہ صرف مغرب کا یہودی ہے' جو پوری دنیا سے بدلے لے رہا ہے۔ یہودی اور عیسائی بہت سخت دشمن تھے۔ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ عیسائیوں نے ان پر بہت ظلم کیا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے یہودیوں نے عیسائیوں سے بدلہ لیا۔ ایک طرف ان کے خاندانی نظام اور مذہب کو تباہ و برباد کر دیا' اور دوسری جانب ان کی معیشت پر چھا گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج عالمِ عیسائیت کی پونے دو ارب آبادی مٹھی بھر یہودیوں کے آہنی شکنجوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ عیسائیوں سے اپنا قرض چکانے کے بعد اب یہودی عالمِ اسلام سے بدلہ لینے پر تلے ہوئے ہیں۔

عصر حاضر میں خلافت کا نظام

میری تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ دورِ حاضر میں نظام خلافت کے قیام کے لیے تین بنیادی باتیں یہ ہیں: (i) حاکمیتِ الٰہیہ (ii) قرآن وسنت کی بالادستی (iii) مباحات کے معاملے میں باہمی مشاورت۔ خلافت کے ان تین بنیادی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے ہمیں ان اداروں کو اختیار کرنا ہے جو مغرب نے ریاست کو چلانے کے لیے بنائے ہیں۔ عین خلافت راشدہ کی کاربن کاپی آج دنیا میں نہیں آ سکتی۔ عصر حاضر میں خلافت کی شکل کیا ہوگی وہ میں عرض کرتا ہوں۔

اس وقت تمدّنی ارتقاء کے نتیجے میں دنیا میں یہ بات طے کر دی گئی ہے کہ ریاست اور شے ہے‘ حکومت اور شے۔ عوام ریاست کے وفادار ہیں‘ نہ کہ حکومت کے۔ حکومت بدلنے کا انہیں حق ہے‘ چاہے انتخابات کے ذریعے بدل دیں یا کسی عوامی تحریک کے ذریعے سے۔ اس کے علاوہ ریاست کے تین بنیادی ستون ہیں: انتظامیہ‘ مقنّنہ اور عدلیہ۔ یہ ادارے خلافت راشدہ میں علیحدہ علیحدہ صورت میں موجود نہیں تھے۔ ان کی علیحدگی مغرب نے متعارف کروائی ہے۔ مقنّنہ کے بارے میں بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں‘ اس لیے کہ اس ادارے کا بنیادی کام قانون سازی ہے اور چونکہ قانون تو سارے کا سارا قرآن وسنت کی صورت میں پہلے سے موجود ہے اور فقہ میں اس کی عملی تشکیل بھی کر دی گئی ہے‘ اس لیے اس کی اصلاً ضرورت ہی نہیں ہے۔ ان لوگوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ اگر قانون سارے کا سارا موجود ہے تو پھر اسلام میں اجتہاد کا دروازہ کیوں کھلا رکھا گیا ہے؟ اجتہاد کا باقی رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا میں نئے نئے مسائل پیدا ہوں گے‘ جن میں اجتہاد کے ذریعہ سے قرآن وسنت سے رہنمائی لی جائے گی۔

علامہ اقبال نے بھی اجتہاد کی بات کہی ہے‘ لیکن لوگ اس کو صحیح طرح سمجھ نہیں پائے‘ حتیٰ کہ ان کا بیٹا بھی ان کے نظریہ کو نہیں سمجھ سکا۔ اقبال نے کہا ہے کہ اب اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ ہوگا۔ سیکولر طبقہ نے اس سے یہ مراد لیا ہے کہ پارلیمنٹ جو بھی قانون سازی کر دے بس وہی ٹھیک ہے اور وہی دین ہے۔ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ اقبال کے نظریہ اجتہاد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ بات پیش نظر رہے کہ دو چیزیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ایک ہے اجتہاد کرنے والا اور ایک ہے اجتہاد کو نافذ کرنے والا۔ مثلاً عباسی دور میں اجتہاد قاضی ابویوسف کر رہے تھے جبکہ اسے نافذ ہارون الرشید کر رہا تھا۔ قاضی ابویوسف کے پاس تو نفاذ کی طاقت نہیں تھی۔ اسی طرح قاضی ابویوسف کے تقریباً ہزار سال بعد اورنگزیب عالمگیر کے زمانے میں ضرورت محسوس ہوئی کہ فقہ حنفی کو از سر نو مرتب کیا جائے۔ اس کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی‘ جس میں پورے ہندوستان کے ممتاز حنفی علماء وفقہاء کو اکٹھا کیا گیا۔ انہوں نے بیٹھ کر نئے فتاویٰ مرتب کیے‘ جن کا نام ’’فتاویٰ

عالمگیری'' پڑا۔ظاہر ہے' یہ فتوے عالمگیر کے نہیں تھے۔ان کا نام ''فتاویٰ عالمگیری'' اس لیے پڑا کہ انہوں نے ان کو مرتب کروایا اور پھر ان کا نفاذ کیا۔ کیونکہ علماء اجتہاد تو کر سکتے تھے لیکن اسے نافذ نہیں کر سکتے تھے۔اسی طرح آج بھی اجتہاد علماء ہی کریں گے۔اس کام میں دیوبندی' بریلوی' اہل حدیث' شیعہ تمام علماء شامل ہوں گے۔لیکن ان علماء کے اجتہادات میں سے نافذ کون سا اجتہاد ہوگا؟ یہ فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی۔اسی کو اقبال نے اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ کا نام دیا ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو مباحات میں سے ہیں۔مثلاً کیا ریاست وحدانی ہوگی یا وفاقی؟ فیڈرل ہوگی یا کنفیڈرل؟ ان میں سے کسی ایک شے کا تعین پارلیمنٹ کرے گی۔قرآن نے تو کسی شے کو بھی لازم نہیں کیا۔پارلیمنٹ کثرتِ رائے سے ان کا فیصلہ کرسکتی ہے۔اگرچہ خلافتِ راشدہ وحدانی تھی' جیسے آج بھی دنیا میں بعض مما لک میں وحدانی نظام ہے' لیکن ہمیں اس کا پابند نہیں بنایا گیا۔اسی طرح شریعت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے کہ نظامِ حکومت کون سا ہو۔نظام پارلیمانی بھی ہوسکتا ہے اور صدارتی بھی۔شریعت کے نزدیک دونوں مباح ہیں' کوئی بھی حرام نہیں ہے۔ہاں خلافتِ راشدہ سے قریب تر صدارتی نظام ہے۔اس نظام میں ایگزیکٹو اتھارٹی ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے' جیسے آج امریکہ میں ہے۔حتیٰ کہ امریکی صدر کانگریس کا ممبر بھی نہیں ہوتا۔ایسے ہی وزیر بننے کے لیے سینٹ یا کانگریس کا ممبر ہونا ضروری نہیں ہے۔عوام نے الیکشن کے ذریعے بس صدر کو منتخب کرنا ہے' باقی صدر خود دیکھے گا کہ ملک میں مالیات کا سب سے بڑا ماہر کون ہے' خارجہ امور کا سب سے بڑا ماہر کون ہے۔وہ کسی یونیورسٹی کے پروفیسر کو بھی بلا کر وزیر بنا سکتا ہے۔ویسے وہاں وزیر تو کہلاتے نہیں' سیکرٹریز آف سٹیٹ کہلاتے ہیں۔اگر صدر کانگریس کے کسی ممبر کو اپنا وزیر یعنی سیکرٹری بنانا چاہتا ہے تو اسے اپنی رکنیت سے استعفا دینا پڑے گا۔اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ مقنّنہ اور انتظامیہ علیحدہ علیحدہ رہیں۔پارلیمانی نظام میں سب کچھ گڈمڈ ہوتا ہے۔پھر یہ کہ یہ نظام بہت غیر مستحکم ہوتا ہے۔

صدارتی نظام میں صدر منتخب ہو جانے کے بعد صدر کو کانگریس میں اقلیت یا اکثریت کی فکر نہیں ہوتی۔ جب ایک بار وہ منتخب ہو جائے تو پھر وقت مقررہ تک صدر رہے گا۔ اس کے برعکس پارلیمانی نظام کا معاملہ یہ ہے کہ اگر ایک پارٹی کی حکومت ہے' اور حکومتی پارٹی کے چند آدمی پارٹی چھوڑ کر دوسری طرف چلے گئے تو اکثریت سے محروم ہو جانے کی بنا پر وہ حکومت ختم ہو جائے گی۔ اسی لیے تو ہمارے ہاں عوام کی بجائے ارکانِ پارلیمنٹ کی حفاظت کی جاتی ہے کہ کہیں دوسری پارٹی میں نہ چلے جائیں' اور انہیں بڑی بڑی سیاسی رشوتیں دی جاتی ہیں اور ان کے لمبے چوڑے ناروا مطالبے پورے کیے جاتے ہیں کہ ہماری حکومت باقی رہے۔ لہٰذا حکومت کی ساری توجہ ''مینڈکوں کی پنسیری'' کو سنبھالنے پر مرکوز رہتی ہے۔ ان حالات میں گڈ گورننس کہاں سے آئے گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ پارلیمانی نظام انتہائی غیر معقول نظام ہے' کیونکہ یہ طاقت کے دو مراکز (Centres of Power) بناتا ہے' یعنی صدر اور وزیراعظم' اور ان میں کسی طرح بھی توازن نہیں ہو سکتا۔ عدم توازن کی بنا پر یا تو صدر بالکل بے اختیار ہو کر رہ جاتا ہے' اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی اور وزیراعظم ہی کے ہاتھ میں سب کچھ ہوتا ہے' جیسے صدر فضل الٰہی چوہدری اور وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کا معاملہ تھا۔ یا پھر صورت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے کہ صدر تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور وزیراعظم کے پاس کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اس کی مثال صدر ضیاء الحق اور وزیراعظم محمد خان جونیجو کی ہے۔ ہمارے ہاں یہ نظام برطانوی استعمار کی وجہ سے آیا ہے' بلکہ دنیا میں جہاں بھی برطانوی حکومت رہی ہے' وہاں پارلیمانی نظام رائج ہے۔ برطانیہ کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بادشاہ اور اپنی ملکہ کو تو لازماً کندھے پر اٹھائے رکھنا ہے۔ ہیڈ آف دی سٹیٹ بہر صورت ملکہ ہو گی اور ہیڈ آف دی گورنمنٹ وزیراعظم۔ لیکن اکثر ممالک میں یہی ثنویت درحقیقت عدمِ استحکام کا باعث بنتی ہے۔

مباحات میں اور بھی بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں' مثلاً اگر طرزِ حکومت وفاقی ہے تو صوبوں کے اختیارات کتنے ہونے چاہئیں' مرکز کے کتنے ہونے چاہئیں۔ اسی طرح

بجٹ کا مسئلہ ہے کہ تعلیم پر کتنا خرچ کریں گے' صحت پر کتنا خرچ کریں گے؟ انتظامیہ اور اسٹیبلشمنٹ پر کتنا خرچ کریں گے؟ یہ سارے فیصلے پارلیمنٹ کرے گی ۔مباحات میں پارلیمنٹ کسی بھی ایک شے کو متعین کر سکتی ہے ۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ قانون کی ضرورت نہیں' بس فقہ حنفی موجود ہے اسے نافذ کر دو۔ یہ باتیں بڑی ناسمجھی کی ہیں۔ایسی باتیں صوفی محمد صاحب جیسے لوگ کہتے ہیں جو خلوص و اخلاص کا تو مجسمہ ہیں لیکن ان کی ذہنی سطح زیادہ اونچی نہیں ہے۔

اسی طرح ایک خیال یہ پایا جاتا ہے کہ اسلامی ریاست میں دو یا تین پارٹیاں نہیں ہوسکتیں۔ یہ خیال بھی درست نہیں۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ ون پارٹی سسٹم تو سب سے بڑی خرابی ہے۔کمیونزم کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہی ون پارٹی گورنمنٹ ہے۔اس نظام کے تحت اگر آپ پارٹی کے ممبر ہیں تو آپ کو ووٹ کا حق حاصل ہے' ورنہ آپ کا ووٹ ہی نہیں ہے۔اس حوالے سے کمیونزم کا نظام غیر فطری تھا۔ہاں یہ ضرور ہے کہ جتنی بھی پارٹیاں سیاسی میدان میں ہوں گی' وہ پابند ہوں گی کہ اپنے منشور میں کوئی خلافِ اسلام بات نہیں لاسکیں گی۔ جب یہاں قانون سازی خلاف اسلام نہیں ہوسکتی تو آپ اسلام سے متضاد کوئی بات اپنے منشور میں بھی نہیں رکھ سکتے۔ ہر شہری کو یہ کہنے کا حق ہوگا کہ فلاں پارٹی نے جو منشور دیا ہے اس میں سے فلاں شق کتاب وسنت کے منافی ہے۔ اس کے بعد پارٹی کو وہ شق ختم کرنی پڑے گی۔گویا منشور پر سٹیٹ کا کنٹرول ہوگا کہ وہ کتاب وسنت سے تجاوز نہ کرے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ انتخابات ہی سرے سے غلط ہیں' کیونکہ ان میں آدمی عہدے کا امیدوار ہوتا ہے۔ میں پہلے ثابت کر چکا ہوں کہ امیدواری حرام نہیں ہے۔ البتہ انتخابات کے حوالے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ووٹ کا حق کسے حاصل ہوگا؟ کیا صرف متقی لوگ ووٹ دیں گے؟ اگر یہی بات مان لی جائے تو پھر کون طے کرے گا کہ ایک شخص متقی ہے یا نہیں؟ کیا لوگوں کی داڑھیاں ناپی جائیں گی یا مسجد کے اندر حاضری کا ریکارڈ دیکھا جائے گا؟ یہ تمام باتیں ناممکنات میں سے ہیں۔ ہر مسلمان کو ووٹ دینے

کا حق حاصل ہوگا' چاہے متقی ہو' یا فاجر ہو۔ اس بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول بہت اہم ہے کہ: **المُسلم کفوٌ لکل مُسلم** ''مسلمان سب آپس میں برابر ہیں''۔ قانونی حیثیت سب کی ایک جیسی ہے۔ اس کی مثال میں یہ دیا کرتا ہوں کہ اگر ایک باپ کے دو بیٹے ہیں' ایک متقی اور تہجد گزار ہے اور دوسرا فاسق و فاجر ہے تو باپ کی وراثت میں متقی کو زیادہ اور فاسق و فاجر کو کم حصہ نہیں ملے گا۔ دونوں کا حصہ برابر ہوگا۔

ووٹر کے بارے میں ہم یہ طے کر سکتے ہیں کہ ووٹر کی عمر کتنی ہو' اٹھارہ سال ہو یا چوبیس سال ہو یا پچیس سال ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں یہ دیکھا جائے کہ سوچ میں ٹھہراؤ کس وقت پیدا ہو جاتا ہے اور اس بنیاد پر عمر کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ انتخابی عمل میں یہ بھی ضروری ہوگا کہ امیدوار کے اثاثوں کی مکمل جانچ پڑتال ہو۔ اُس سے پوچھا جائے کہ تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی ہے' اس کا حساب دو۔ تمہارے پڑوسی تمہارے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اسلامی شریعت میں تو اس حد تک نظام سخت ہے کہ کوئی شخص اُس وقت تک گواہی نہیں دے سکتا جب تک کہ اس کی سکریننگ نہ ہو۔ (آج کل ہماری عدالتوں میں لوگ قرآن بغل میں لیے پھرتے ہیں کہ اتنے پیسے دے دو' جہاں چاہو گواہی دلوا دو۔ اسلام میں اس کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔) فقہ میں اسے ''تزکیۃ الشّہود'' کہتے ہیں۔ شہود شاہد کی جمع ہے' جس کے معنی گواہ کے ہیں۔ تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ ان کی سکریننگ ہوگی اور اگر کوئی شخص قابل اعتماد ثابت نہ ہوا اور اس کی طرف سے ایک دفعہ جھوٹی گواہی دینا ثابت ہو گیا تو اب ساری عمر اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ یہ ہمارا نظامِ عدالت ہے۔ بہرحال جو شخص امیدوار بن کر آئے گا' وہ پوری سکریننگ کے بعد آئے گا۔

عالمی خلافت

آخری بات یہ ہے کہ خلافت کا نظام دنیا میں دوبارہ آکر رہے گا، اور اب آئے گا تو گلوبل یعنی عالمگیر ہوگا۔ تبھی تخلیق آدم کا مقصد اور رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی پوری ہوگی۔ کیونکہ آدم علیہ السلام زمین کے کسی ایک ٹکڑے کے لیے نہیں بلکہ پوری زمین کے

لیے خلیفہ بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اب جو خلافت آئے گی وہ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ ہوگی۔ اس خلافت کے بارے میں بھی بعض سادہ اور بہت ہی متقی لوگ کہتے ہیں کہ یہ ساری دنیا میں ایک دم آنی چاہیے۔ یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ ساری دنیا میں ایک ہی دفعہ اگر آ سکتی تو حضورﷺ کے دست مبارک سے آتی۔ آپﷺ سے آگے کون بڑھ سکتا ہے؟ یہ ہر مسلمان کے دل کی تمنا تو ہوسکتی ہے' مگر عملاً ایسا نہیں ہوسکتا۔ روئے ارضی پر خلافت کا قیام تدریجاً ہوگا۔ حضورﷺ کے زمانے میں بھی پہلے جزیرہ نمائے عرب میں خلافت قائم ہوئی تھی۔ بعد میں یہ مغرب کی طرف شام اور مصر سے گزر کر بحیرۂ اوقیانوس تک چلی گئی اور مشرق میں عراق' ایران اور خراسان سے گزر کر دریائے جیحوں تک جا پہنچی۔ اب بھی خلافت پہلے کسی ایک ملک میں آئے گی۔ وہاں سے یہ ان شاء اللہ پوری دنیا تک پھیلے گی۔

"پاکستان اسی مقصد کے لیے بنایا گیا تھا کہ یہ دنیا میں اسلام کی تجربہ گاہ بن سکے' لیکن ہم نے اللہ سے وعدہ خلافی کی۔ اگرچہ قراردادِ مقاصد میں اللہ کی حاکمیت اور قرآن وسنت کی بالادستی کو تسلیم کر لینے سے ملک میں اصولاً خلافت قائم ہوگئی' لیکن اس کے بعد اسلام کے تفصیلی نظام (شریعت) کو نافذ کرنے کے لیے ہم نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس کی وجہ سے آج ہم مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔ اللہ سے بے وفائی اور دین سے غداری کی پاداش میں ہماری پیٹھ پر اللہ کے عذاب کا پہلا کوڑا ۱۹۷۱ء میں پڑا تھا۔ اب کیا ہوتا ہے' اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اِس وقت تو صورت حال ایسی ہے جیسے کسی ہنڈیا کے اندر موم ڈال کر گرم کیا جا رہا ہو۔ کچھ پتا نہیں' اب اس ملک کا کیا ہوگا۔ اب تو بس اللہ سے خیر مانگی جائے کہ وہ ہمیں مزید مہلت دے دے۔ ہم میں سے ہر ایک کی ذمہ داری ہے کہ اس ملک میں نظامِ خلافت قائم کرنے کی جدوجہد میں شریک ہوجائے۔ ہم میں سے جو بھی اس کے لیے کمر کس لے گا' اور غلبۂ دینِ حق کے لیے کوشش کرے گا' یہاں کامیاب ہو یا نہ ہو' اللہ کے ہاں ضرور کامیاب ہوجائے گا' اور یہی اصل کامیابی ہے۔"

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم و لسائر المسلمین والمسلمات○○

(ترتیب وتدوین: حافظ فہد اللہ مراد / محبوب الحق عاجز)

تکبُّر

رذائلِ اَخلاق کا سرچشمہ

عتیق الرحمٰن صدیقی

الکِبرُ و التَّکبُّرُ و الاسْتِکبارُ کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں۔ پس کبر وہ حالت ہے جس کے سبب سے انسان عُجب میں مبتلا ہو جاتا ہے' اور عُجب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا خیال کرے۔ سب سے بڑا تکبر قبولِ حق سے انکار اور عبادت سے انحراف کر کے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں تکبر کرنا ہے۔ الاسْتکبار (استفعال) اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ انسان بڑا بننے کا قصد کرے' اور یہ بات اگر منشائے شریعت کے مطابق اور برمحل ہو اور پھر ایسے موقع پر ہو جس پر تکبر کرنا انسان کو سزاوار ہے تو محمود ہے۔ دوم یہ کہ انسان جھوٹ موٹ بڑائی کا اظہار کرے اور ایسے اوصاف کو اپنی طرف منسوب کرے جو اس میں موجود نہ ہوں' یہ مذموم ہے' اور قرآن میں یہی دوسرا معنی مراد ہے۔ فرمایا: ﴿اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ﴾ (البقرۃ:۳٤) ''اس (شیطان) نے انکار کیا اور غرور میں آ گیا۔'' ﴿اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَھْوٰٓی اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ﴾ (البقرۃ:۸۷) ''تو جب بھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسی باتیں لے کر آئے جن کو تمہارا جی نہیں چاہتا تھا' تم سرکش ہو جاتے رہے۔'' ﴿وَاَصَرُّوْا وَاسْتَکْبَرُوا اسْتِکْبَارًا ⑦﴾ (نوح) ''اور اَڑ گئے اور اکڑ بیٹھے۔'' (مفردات القرآن)

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی کسی شکل میں کوئی حسن' خوبی' وصف اور کمال موجود ہے اس کا منبع' مصدر اور سرچشمہ اللہ ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔ کسی انسان یا کسی دوسری مخلوق میں اگر کوئی کمال پایا جاتا ہے تو وہ صرف اُس کا عطیہ ہے' اس میں انسان کا کوئی ذاتی کمال نہیں۔ اللہ کی ودیعت کردہ خوبی پر اترانا' اکڑنا اور غرور کرنا بندۂ مؤمن کی شان نہیں۔ ایک آدمی اگر

کسی صفت سے متصّف کر دیا گیا ہے‘ اس کا خیال اس کے دل میں پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے‘ یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں‘ لیکن جب یہ خیال اتنا ترقی کر جائے کہ اس وصف سے محروم لوگوں کو وہ حقیر جاننے لگے تو یہ تکبر شمار ہوگا۔ اس بداخلاقی کا اظہار سب سے پہلے شیطان نے کیا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں بڑا جانا۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾﴾ (الاعراف) ’’بولا: میں اس سے بہتر ہوں‘ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے‘‘۔ اس شیخی بگھارنے اور گھمنڈ کا اظہار کرنے پر اسے مردود قرار دیا گیا‘ جو کسی ذاتی استحقاق کے بغیر جھوٹے پندار میں مبتلا ہوا۔ اس بے بنیاد اِدّعا پر اسے ذلیل کر کے محفل مقربین سے نکال دیا گیا۔ ﴿قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا یَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِیْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ ﴿۱۳﴾﴾ (الاعراف) ’’اللہ نے فرمایا: اچھا تو یہاں سے نیچے اتر‘ تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے‘ نکل جا کہ درحقیقت تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں۔‘‘

شیطان میں نسلی تفاخر ابھر کر سامنے آیا اور اس نے آدم کو حقیر سمجھا۔ اپنی عظمت کے تخیل کے ساتھ دوسروں کی تحقیر کا جذبہ ابھرآنا اللہ کے ہاں نہایت ناپسندیدہ اور مبغوض ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ)) قَالَ رَجُلٌ : اِنَّ الرَّجُلَ یُحِبُّ اَنْ یَّكُوْنَ ثَوْبُهٗ حَسَنًا وَنَعْلُهٗ حَسَنَةً. قَالَ : ((اِنَّ اللّٰهَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ، اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ))(۱)

’’جس کسی دل میں ذرہ برابر تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا‘‘۔ اس پر ایک آدمی نے پوچھا: ’’آدمی چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اور جوتے اچھے ہوں (تو کیا یہ بھی تکبر میں داخل ہے اور کیا ایسا ذوق رکھنے والا جنت سے محروم رہے گا؟) آپؐ نے فرمایا: ’’(نہیں یہ تکبر نہیں ہے) اللہ خود جمیل ہے اور وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔ تکبر کے معنی ہیں اللہ کے حق بندگی کو ادا نہ کرنا اور اس کے بندوں کو حقیر گردانا‘‘۔

معلوم ہوا کہ تکبر اور جمال پسندی دو مختلف چیزیں ہیں۔ اچھا لباس پسند کرنا یا اچھے جوتے پہننا تکبر نہیں۔ ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب تحریم الکبر و بیانه

ہوں اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے' میں یہ نہیں پسند کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن میں تفوّق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا: ''نہیں' تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے''۔[۱]

انبیاء علیہم السلام کے مقابل ہمیشہ وہی لوگ آئے جو اپنے حسب نسب اور مال و دولت پر نازاں تھے۔ وہ نہ صرف خود ان کی مزاحمت پر تلے رہتے تھے بلکہ عام لوگوں کو بھی انبیاء کی دعوت قبول کرنے سے روکتے تھے۔ اگر کچھ لوگ انبیاء کی پکار پر لبیک کہتے تو یہ یوں گویا ہوتے: ﴿وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ﴾(ھود:۲۷) ''ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس انہی لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے۔'' مکہ مکرمہ میں اونچے طبقے والے حضور نبی کریم ﷺ کے بارے میں کہتے کہ ان کے ساتھ بڑے لوگ نہیں' بس کچھ غلام اور ادنیٰ طبقہ کے عوام ہیں' جو عقل سے کورے ہیں اور ضعیف الاعتقاد بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو عظیم نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے حواریوں کے پاس بھیجا' مگر انہوں نے تکبر و غرور میں اللہ کی ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ ﴿فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾﴾ (المؤمنون) ''مگر انہوں نے تکبر کیا اور وہ لوگ تھے ہی سرکش۔'' انہوں نے اپنے آپ کو بالاتر مخلوق گردانا اور سرکشی کی راہ اختیار کی۔ گویا پیغمبروں کی دعوت کو ان لوگوں نے قبول کرنے سے انکار کیا جو مذہبی' قومی یا سیاسی اعتبار سے اللہ کے رسولوں سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتے تھے۔ قرآن نے بڑی شدت کے ساتھ ان کے استکبار کو ہدفِ ملامت بنایا ہے اور کہا ہے کہ مغرور اور فخار لوگ اللہ کی محبت کے اعزاز سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ﴿۳۶﴾﴾ (النساء) ''اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو مغرور اور فخار ہو۔'' مزید فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾﴾ (النحل) ''اللہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

کبر و غرور بے شمار مفاسد کو جنم دیتا ہے۔ دولت' اقتدار اور حسن آدمی کو ایک عجیب نشے میں مدہوش کر دیتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو بزعم خود کوئی خاص شے گرداننے لگتا ہے۔ وہ عام لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اپنی کسر شان سمجھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی چوکھٹ پر لوگ سرنگوں ہوتے رہیں اور اسے ہر جگہ اعزاز و افتخار سے نوازتے رہیں۔ ہر مجلس میں وہ صدر نشین بننے کا آرزومند ہوتا ہے' چاہتا ہے کہ لوگ اسے پہلے سلام کریں اور اس کے پیچھے پیچھے چلیں' ڈر کر اور

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب اللباس' باب ما جاء فی الکبر

سہم کراس سے بات کریں۔ غرضیکہ اخلاقی اور معاشرتی اعتبار سے کبر و غرور کے جو ثمرات ظاہر ہوتے ہیں وہ کدورت' تنفر اور انا پرستی کا ماحول پیدا کرتے ہیں اور صحت مند معاشرے کی تشکیل میں سدّ راہ بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محسن انسانیتﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔ حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ الْجَوَّاظُ وَلَا الْجَعْظَرِیُّ)) (۱)

''متکبر آدمی جنت میں داخل نہ ہوگا اور نہ وہ جو جھوٹی شیخی بگھارتا ہے۔''

مولانا جلیل احسن ندوی اس حدیث کی شرح میں رقم طراز ہیں:

''اصل حدیث میں 'جواظ' اور 'جعظری' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'جواظ' کے معنی ہیں متکبر' متکبرانہ چال چلنے والا' بدمعاش' بدکار' مال کو جمع کرنے والا' بخل کرنے والا۔ اور 'جعظری' اس کو کہتے ہیں جس کے پاس ہے تو کچھ نہیں مگر لوگوں کے سامنے اپنے پاس قارون کا خزانہ ہونے کا دعویٰ کرتا پھرتا ہے۔ یہ دولت کے ساتھ مخصوص نہیں' زہد و تقویٰ اور علم کی دنیا میں بھی متکبر اور جھوٹی شیخی بگھارنے والے پائے جاتے ہیں''۔ (راہِ عمل)

کبر و غرور کے بعض مظاہر ایسے ہیں کہ جن کا تعلق امراء و سلاطین سے ہے۔ ان کے متعلق نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہیں اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالینا چاہیے''۔ ایک بار آپؐ خود عصا ٹیکے ہوئے نکلے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ فرمایا کہ ''عجمیوں کی طرح تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوا کرو''۔ (۲)

بڑے بڑے آداب و القاب سے کسی کو متصف کرنے میں احتیاط لازمی ہے۔ کسی شخص کی تعریف و توصیف میں قلابے ملانا بڑا گناہ ہے' ایسی قصیدہ خوانی شعر میں ہو یا نثر میں ناپسندیدہ عمل ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی ایسے لوگ موجود تھے اور آج کے نام نہاد روشن خیالی کے دور میں بھی ایسے قصیدہ خوانوں کی کوئی کمی نہیں۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا رَاَیْتُمُ الْمَدَّاحِیْنَ فَاحْثُوْا فِیْ وُجُوْھِھِمُ التُّرَابَ)) (۳)

---

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب فی حسن الخلق۔

(۲) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب فی قیام الرجل للرجل۔

(۳) صحیح مسلم' کتاب الزھد والرقائق' باب النھی عن المدح اذا کان فیہ افراط...

''جب تم تعریف کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے منہ پر مٹی پھینکو۔''

بعض برخود غلط انسان اپنی کبریائی اور بڑائی کے دعوے دار ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ کبریائی فقط اللہ کو زیب دیتی ہے جو حی و قیوم ہے' انسان تو فانی ہیں' وہ اپنی حقیقت کو فراموش کر کے اللہ تعالیٰ کا حریف بننے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (الجاثیة)

''اور اسی کے لیے کبریائی اور بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں' اور وہی ہے زبردست اور حکمت والا''۔

کبر و غرور کی بعض بدنما صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا﴾ (بنی اسراء یل)

''زمین پر اکڑ کر نہ چلو' نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔''

مطلب یہ ہے کہ جباروں اور متکبروں کی سی روش اختیار نہ کرو۔ انفرادی طور پر بھی تم غرور میں مبتلا نہ ہو اور تمہارا قومی رویہ بھی اکڑ اور تبختر سے پاک ہو۔ سورۂ لقمان میں فرمایا:

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝﴾

''لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر' نہ زمین میں اکڑ کر چل' اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز پست رکھ' یقیناً سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔''

صاحب تفہیم القرآن لکھتے ہیں:

''مختال کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنی دانست میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہو۔ اور فخور اس کو کہتے ہیں جو اپنی بڑائی کا دوسروں پر اظہار کرے۔ آدمی کی چال میں اکڑ اور اتراہٹ اور تبختر کی شان لازماً اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کے دماغ میں تکبر کی ہوا بھر جاتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ دوسروں کو اپنی بڑائی محسوس کرائے''۔

(چال میں اعتدال کے بارے میں رقم طراز ہیں:) ''دراصل جو چیز یہاں مقصود ہے وہ تو نفس کی اس کیفیت کی اصلاح ہے جس کے اثر سے چال میں تبختر اور مسکینی کا ظہور ہوتا ہے۔ بڑائی کا گھمنڈ اندر موجود ہو تو وہ لازماً ایک خاص قسم کی چال میں ڈھل کر ظاہر ہوتا ہے جسے دیکھ کر نہ صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی کسی گھمنڈ میں مبتلا ہے بلکہ چال کی شان یہ تک بتا دیتی ہے کہ کس گھمنڈ میں مبتلا ہے۔ دولت' اقتدار' حسن' علم' طاقت اور ایسی ہی دوسری جتنی چیزیں بھی انسان کے اندر تکبر پیدا کرتی ہیں ان میں سے ہر ایک کا گھمنڈ اس کی چال کا ایک مخصوص ٹائپ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس چال میں مسکینی کا ظہور بھی کسی نہ کسی مذموم نفسی کیفیت کے اثر سے ہوتا ہے......لقمان کی نصیحت کا منشا یہ ہے کہ اپنے نفس کی ان کیفیات کو دور کرو اور ایک سیدھے سادھے معقول اور شریف آدمی کی سی چال چلو جس میں نہ کوئی اینٹھ اور اکڑ ہو نہ مریل پن' اور نہ ریا کارانہ زہد و انکسار''۔ (۱)

عز و افتخار اور کبریائی اللہ کی شان ہے' اس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ بندے کو بندگی کی شان ہی جچتی ہے۔ اس عبودیت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ تواضع و خاکساری اختیار کرے۔ اللہ نے اپنے خاص بندوں کا وصف یوں بیان فرمایا:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ (الفرقان)

''رحمٰن کے اصل بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام!''

گویا رحمٰن کے بندے عاجزی اور فروتنی برتتے ہیں' اکڑتے اور اینٹھتے ہوئے نہیں چلتے۔ ان کی چال ایک شریف اور سلیم الطبع آدمی کی سی چال ہوتی ہے۔ خاکساری اور عاجزی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ ذلیل اغراض کے لیے اپنی خودداری کا سودا کرے بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ انسان میں کبر و غرور پیدا نہ ہونے پائے۔ ہاں اگر خاکسارانہ روش سے انسان کا ضعف ظاہر ہو تو وہاں اسلام نے عارضی طور پر خوددارانہ کبر و غرور کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح اسلام نے جہاد کے موقع پر قوت کے اظہار کا حکم دیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ: ''بعض غرور کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے۔ جنگ اور صدقہ کے موقع پر اپنے جی میں اترانا اللہ کو پسند ہے اور ظلم و فخر پر اترانا ناپسند''۔ (۲)

---

(۱) تفہیم القرآن' جلد چہارم۔

(۲) سنن ابی داوٗد' کتاب الجهاد' باب فی الخیلاء فی الحرب۔

رسول اللہ ﷺ دوزانو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ ایک بدو بھی اس وقت موجود تھا' اس نے کہا بیٹھنے کا یہ کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: ''خدا نے مجھے شریف بندہ بنایا ہے اور متکبر و سرکش نہیں بنایا''(۱)۔ ایک صحابی نے جن کو لوگ مغرور و متکبر سمجھتے تھے اس قسم کے افعال سے اپنے کبر و غرور کی تردید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مغرور ہوں حالانکہ میں گدھے پر سوار ہوتا ہوں' کمبل اوڑھتا ہوں اور بکری کا دودھ دوہتا ہوں' اور رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ہے کہ ''جو شخص یہ سب کام کرتا ہے اس میں غرور نہیں پایا جاتا۔''(۲)

عرب اپنے حسب و نسب پر اتراتے تھے اور اپنے آپ کو برتر خیال کرتے تھے۔ قرآن نے ان کے خیال کی تردید میں فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا﴾ (الحجرات:۱۳) ''لوگو' ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو''۔ یہاں بتا دیا گیا کہ شرافت و عظمت کی بنیاد نسب و حسب پر نہیں' انسان اور انسان کے درمیان فضیلت اور برتری کی بنیاد صرف اخلاقی فضیلت ہے' پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس آیۂ کریمہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ''خداوند تعالیٰ نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا' اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں' مؤمن پرہیزگار اور بدکار بدبخت۔ تم لوگ آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو جہنم کا کوئلہ ہیں یا خدا کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منہ سے نجاست کو گھسیٹتا ہوا چلتا ہے''۔(۳)

اسلام نے تمدّنی اور اجتماعی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مال و دولت کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اسے خیر سے تعبیر کیا اور اِسراف و تبذیر سے منع کیا اور نصیحت فرمائی کہ مال و دولت کو فخر و غرور کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اسی طرح مال جمع کرنے کے عمل میں مسابقت کو بھی ناپسندیدہ قرار دیا۔ قرآن نے ﴿اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ ﴾(التکاثر) کہہ کر بتایا کہ ''تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال

(۱) سنن ابن ماجہ' کتاب الاطعمۃ' باب الاکل متکئًا۔
(۲) سنن الترمذی' کتاب البر والصلۃ' باب ما جاء فی الکبر۔
(۳) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب فی التفاخر بالاحساب۔

رکھا ہے''۔ حضور نبی کریمﷺ نے ﴿اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝١﴾ آیت تلاوت کرنے کے بعد فرمایا: ''آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال' میرا مال' حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے جس کو تو نے صدقہ میں دے ڈالا' کھا پی ڈالا اور پہن کر پھاڑ ڈالا''۔(۱)

مال و دولت کا حصول ایک بندۂ مسلم کا مطمح نظر قرار پائے اور زیادہ سے زیادہ دولت کی طلب میں اسے اس بات کی کوئی پروانہ ہو کہ وہ کس ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے' معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی فکر اسے دبلا کر دے اور وہ اس فکر سے غافل ہو جائے کہ معیارِ آدمیت گرتا جا رہا ہے تو ایسا آدمی اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایک ایسے آدمی کی مثال پیش فرمائی جسے اللہ نے دو باغ عطا کیے تھے۔ جب وہ پھلے پھولے اور بار آور ہوئے تو وہ اس پر اترانے لگا۔ سورۃ الکہف میں اس کا اپنے ہمسائے کے ساتھ مکالمہ نقل ہوا ہے:

﴿فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكۡثَرُ مِنۡكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ۝٣٤ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنۡ تَبِيۡدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۝٣٥ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰى رَبِّىۡ لَاَجِدَنَّ خَيۡرًا مِّنۡهَا مُنۡقَلَبًا ۝٣٦ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرۡتَ بِالَّذِىۡ خَلَقَكَ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ سَوّٰٮكَ رَجُلًا ۝٣٧﴾

''وہ اپنے ہمسائے سے گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگا: میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقتور نفری رکھتا ہوں۔ پھر وہ اپنی جنت میں داخل ہوا اور اپنے نفس کے حق میں ظالم بن کر کہنے لگا: میں نہیں سمجھتا کہ یہ دولت کبھی فنا ہو جائے گی' اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی' تاہم اگر کبھی مجھے اپنے ربّ کے حضور پلٹایا بھی گیا تو ضرور اس سے بھی زیادہ شاندار جگہ پاؤں گا۔ اس کے ہمسائے نے گفتگو کرتے ہوئے اس سے کہا: کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور پھر تجھے ایک پورا آدمی بنا کھڑا کیا؟''

آخر کار ہوا یہ کہ اس کا سارا ثمرہ مارا گیا اور وہ اپنے انگوروں کے باغ کو ٹٹیوں پر الٹا پڑا دیکھ کر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اس کے تفاخر نے اس کی دولت کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔

بندے کا حسن و کمال یہی ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں اللہ کا بندہ بن کر رہے اور اس کا ہر عمل

(۱) سنن الترمذی' کتاب الزھد' باب ما جاء فی الزھادۃ فی الدنیا۔

بندگی اور عبدیت کا مظہر ہو۔ اس لیے کہ تکبر کا سزاوار صرف اللہ ہے جو عزیز و حکیم ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیثِ نبویؐ میں فروتنی و تواضع کی اہمیت اور غرور و نخوت کی شناعت بیان ہوئی ہے:

عَنْ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ: يَا اَيُّهَا النَّاسُ تَوَاضَعُوْا فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: ((مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ ، فَهُوَ فِیْ نَفْسِهٖ صَغِيْرٌ وَفِیْ اَعْيُنِ النَّاسِ عَظِيْمٌ ، وَمَنْ تَكَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ، فَهُوَ فِیْ اَعْيُنِ النَّاسِ صَغِيْرٌ وَفِیْ نَفْسِهٖ كَبِيْرٌ، حَتّٰى لَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِمْ مِنْ كَلْبٍ اَوْ خِنْزِيْرٍ))(۱)

''حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک دن خطبہ میں برسرِمنبر فرمایا: لوگو! فروتنی اور خاکساری اختیار کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپؐ فرماتے تھے: ''جس نے اللہ کے لیے (یعنی اللہ کا حکم سمجھ کر اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے) خاکساری کا رویہ اختیار کیا (اور بندگانِ خدا کے مقابلہ میں اپنے کو اونچا کرنے کے بجائے نیچا رکھنے کی کوشش کی) تو اللہ تعالیٰ اس کو بلند کرے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے خیال اور اپنی نگاہ میں تو چھوٹا ہوگا لیکن عام بندگانِ خدا کی نگاہ میں اونچا ہوگا۔ اور جو کوئی تکبر اور بڑائی کا رویہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو نیچے گرا دے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ عام لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل و حقیر ہو جائے گا، اگرچہ خود اپنے خیال میں بڑا ہوگا، حتیٰ کہ دوسروں کی نظر میں وہ کتے یا خنزیر سے بھی زیادہ ذلیل اور بےوقعت ہو جائے گا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ – وَفِیْ رِوَايَةٍ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ – وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : شَيْخٌ زَانٍ وَمَلِكٌ كَذَّابٌ وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ))(۲)

''تین آدمی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کلام نہیں فرمائے گا اور ان کا تزکیہ نہیں کرے گا — اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ان کی طرف نگاہ نہیں کرے گا — اور ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے: ایک بوڑھا زانی، دوسرا جھوٹا فرماں روا اور تیسرا نادار اور غریب متکبر۔''

---

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان غلظ تحریم اسبال الازار والمن بالعطیۃ......

بعض گناہ اور معصیتیں نہایت سنگین ہوتی ہیں اور بعض حالات میں ان کی سنگینی مزید بڑھ جاتی ہے۔ مذکورہ حدیث میں جن تین برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہونے کے باوجود کوئی غرور وتکبر کی چال چلے۔ حدیث میں تزکیہ نہ کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے گناہ معاف نہ کیے جائیں گے اور وہ قیامت کے دن اللہ کی ہم کلامی اور نظر کرم سے محروم رہیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے مغرورانہ لباس کو تکبر کی علامت قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((**كُلُّ مَا شِئْتَ وَالْبَسْ مَا شِئْتَ مَا اَخْطَأَتْكَ اثْنَتَانِ سَرَفٌ اَوْ مَخِيْلَةٌ**))(۱)

''جو چاہے کھاؤ اور پہنو بشرطیکہ تمہارے اندر اسراف اور گھمنڈ نہ ہو۔''

حضرت ابوسعید خدری ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((**اِزْرَةُ الْمُؤْمِنِ اِلٰى اَنْصَافِ سَاقَيْهِ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ مَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْكَعْبَيْنِ وَمَا اَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ فِي النَّارِ . يَقُوْلُ ثَلَاثًا . لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ اِلٰى مَنْ جَرَّ اِزَارَهٗ بَطَرًا**))(۲)

''مؤمن کا تہبند تو اس کی نصف پنڈلی تک رہتا ہے' اور اگر اس کے نیچے ٹخنوں سے اوپر تو کوئی گناہ نہیں' اور جو ٹخنوں سے نیچے ہو تو وہ جہنم میں ہے (یعنی گناہ کی بات ہے) یہ بات آپ ؐ نے تین بار فرمائی (تاکہ لوگوں پر اس کی اہمیت واضح ہو جائے) اور پھر فرمایا: اللہ اس شخص کی طرف قیامت کے دن نہیں دیکھے گا جو شیخی کے جذبہ سے اپنا تہبند زمین پر گھسیٹے گا۔''

(۱) صحیح البخاری' کتاب اللباس' باب قول اللّٰہ تعالی قل من حرم زینۃ اللّٰہ التی اخرج لعبادہ...... (ترجمۃ الباب)

(۲) سنن ابن ماجہ' کتاب اللباس' باب موضع الازار این ھو۔

دعوت وتحریک

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور علمِ حدیث

عبدالرشید عراقی

ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنے مختلف اَدوار میں ایسے عظیم المرتبت اور جید علمائے کرام پیدا کیے جنہوں نے دین اسلام کی نشر واشاعت، توحید الٰہی اور سنتِ نبوی ﷺ کی ترقی وترویج، ردِّ فرقِ باطلہ، باطل افکار ونظریات کی تردید اور بدعات ومحدثات کا قلع قمع کرنے میں تقریری وتحریری خدمات انجام دیں۔ تصنیف وتالیف کے میدان میں علمائے ندوہ کی خدمات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، جنہوں نے تمام علومِ اسلامیہ یعنی تفسیر، حدیث، تاریخ وسیر، اسماء الرجال، فقہ، عقائد، تصوف واخلاق، علومِ ادب، شعروشاعری، سیاست اور تراجم پر سینکڑوں کتابیں تصنیف کیں۔

علمائے ندوہ میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا حاجی معین الدین ندوی، مولانا سید ریاست علی ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا حافظ محبوب اللہ ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا محمد حنیف ندوی، سید رئیس احمد جعفری ندوی، مولانا ہدایت اللہ ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور کئی دوسرے علماء رحمۃ اللہ علیہم کی علمی ودینی اور سیاسی خدمات قابل ذکر ہیں۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور اپنے دم میں ایک عہد تھے۔ انہوں نے دین وملت کی زبردست خدمت انجام دی۔ ان کی خدماتِ جلیلہ صرف برصغیر (پاک وہندو بنگلہ دیش) تک ہی محدود نہیں بلکہ عالم اسلام اور مغربی دنیا میں بھی ان کی خدماتِ عالیہ کا اعتراف کیا گیا ہے۔ آپ عربی، فارسی اور اردو کے بلند پایہ ادیب تھے۔ انگریزی زبان پر بھی کامل عبور تھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اپنے علم وفضل، وسعتِ مطالعہ اور تبحر علمی کے اعتبار سے بلا امتیاز ہر طبقہ کے افراد میں مقبول تھے۔ آپ ایک بلند پایہ مفسر، محدث، مؤرخ، محقق، معلم، ادیب، نقاد، مبصر، مقرر، صحافی اور مصنف تھے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو رائے بریلی میں رحلت فرمائی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جو

''علی میاں'' کے نام سے معروف تھے' ان کی زندگی گوناگوں مشاغل سے معمور تھی۔ وہ برصغیر' عالم اسلام اور مغربی ممالک میں کئی علمی و دینی' تحقیقی و ادبی انجمنوں کے رکن تھے۔

مولانا علی میاںؒ کا تعلق رائے بریلی کے ایک علمی خاندان سے تھا۔ ان کے والد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ بلند پایہ عالم دین اور طبیب حاذق تھے۔ ندوۃ العلماء کے ناظم بھی رہے۔ ان کی آٹھ جلدوں پر مشتمل مشہور تصنیف ''نُزھۃ الخواطر'' جو عربی زبان میں ہے' اس میں پہلی صدی ہجری سے لے کر ۱۴ ویں صدی ہجری تک ساڑھے چار ہزار علمائے برصغیر کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔

۱۹۲۷ء میں مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ نے امرتسر سے ہفتہ وار اخبار ''توحید'' جاری کیا۔ اس اخبار میں ایک طویل مضمون ''ہندوستان کا مجاہد اعظم'' (سید احمد شہید رائے بریلویؒ) کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ یہ مضمون مولانا محی الدین احمد قصوریؒ کا تحریر کردہ تھا۔ مولانا علی میاں نے اس مضمون کا عربی ترجمہ اپنے برادر بزرگ مولانا حکیم و ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم کے حکم پر کیا' اور یہ عربی مضمون ''السید الامام'' کے عنوان سے علامہ سید رشید رضا مصری کے اخبار ''المنار'' قاہرہ میں شائع ہوا۔ بعد میں یہ مضمون کتابی صورت میں مصر سے شائع ہوا۔ مولانا علی میاںؒ نے عربی میں مضمون نگاری کا آغاز ۱۹۲۲ء میں ''الضیاء'' نامی رسالہ سے کیا جو مولانا مسعود عالم ندویؒ کی ادارت میں ندوۃ العلماء لکھنؤ سے جاری ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں آپ کی کتاب ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ صفحات کی مجموعی تعداد ۹۸۰ ہے۔

مولانا علی میاں اور علمِ حدیث

مولانا علی میاں کو حدیث نبویﷺ سے بہت زیادہ شغف تھا۔ آپ نے ندوۃ العلماء میں حدیث کی تحصیل مولانا حیدر حسن خان ٹونکیؒ سے کی۔ حدیث سے ان کی محبت اور سنت نبویؐ پر عمل اور احکام دینیہ کی پیروی کے بارے میں استاد الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مولانا ابوسبحان روح القدس ندویؒ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا حیدر حسن خاں کے طریقہ درس وطرزِ تحدیث نے جو خالص محدثانہ ومحققانہ اور محدثین یمن کی خصوصیات کا حامل اور شیخ حسین یمانی کے درس کا عکس تھا' مولانا علی میاں کے فکر وخیالات میں وسعت پیدا کی اور عمل بالحدیث کی راہ آسان کردی۔ چنانچہ قراءۃ خلف الامام ہو یا سفر میں جمع بین الصلوٰتین' تعدیل

ارکان فی الصلوٰۃ ہو یا صفت نماز کی ادائیگی کی کیفیت‘ مولانا علی میاں مسلک احناف سے بالکل الگ عاملین بالحدیث کی صف میں نظر آتے ہیں۔ غالبًا مولانا علی میاں اپنی اس توسیع کی وجہ سے مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہرویؒ کی مشہور کتاب ’’تراجم علمائے حدیث ہند‘‘ میں جگہ پانے کے مستحق ہوئے۔

مطالعۂ حدیث مولانا علی میاں کا پسندیدہ موضوع و مشغلہ رہا ہے۔ ایک عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ابوابِ بخاری (کتاب الایمان‘ کتاب العلم) کا درس دینے کا معمول رہا ہے۔ ادھر چند سالوں سے عالمیت کے طلبہ کو ترمذی اور فضیلت کے طلبہ کو صحاحِ ستہ بشمول موطا امام مالک اور مسند احمد کی سند عطا فرماتے۔ نیز حجاز و شام اور ہندوستان کے متعدد علماء و مشائخ کو اجازتِ حدیث عنایت فرمائی۔

مولانا کی سند حدیث کا ذکر آ گیا ہے تو یہ عرض کرتا چلوں کہ مولانا نے سند حدیث دو جلیل القدر محدثین سے حاصل کی۔ ان میں ایک مولانا حیدر حسن خاںؒ (م۱۳۶۱ھ) اور دوسرے صاحب تحفۃ الاحوذی مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ (م۱۳۵۳ھ) ہیں۔ ان دونوں کی سند حدیث شیخ حسین بن محسن یمانیؒ کے طریق سے علامہ شوکانیؒ صاحب نیل الاوطار اور شیخ الاسلام عبدالرحمٰن بن سلیمان الاہدل کے واسطہ سے علماء حرمین تک پہنچتی ہے۔ اور یہاں سید نذیر حسین بہاری ثم الدہلوی (م۱۳۲۰ھ) کے طریق سے مولانا ٹونکی اور مولانا مبارک پوری کی سند شاہ ولی اللہ عن ابی طاہر محمد بن ابراہیم الکردی ائمہ حرمین سے مل جاتی ہے۔ اس طرح مولانا علی میاں یمنی اور حجازی دونوں طرزِ تحدیث کے تلمیذ و خریج ہیں۔

(ماہنامہ القاسم‘ مولانا ابوالحسن علی ندوی نمبر‘ ص۳۳۳)

مولانا علی میاںؒ نے حدیث اور متعلقاتِ حدیث پر کئی ایک مضامین و مقالات تحریر فرمائے۔ حدیث کے موضوع پر ان کے تین قیمتی مقالات ہیں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑے جامع اور مولانا علی میاں کے علم و فضل‘ تبحر علمی اور وسعتِ معلومات کا آئینہ دار ہیں۔ یہ تینوں مقالات عربی میں ہیں اور کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) المدخل الی دراسات الحدیث النبوی الشریف

(۲) دور الحدیث فی تکون المناخ الاسلامی وصیانته

(۳) محمد بن اسمٰعیل البخاری وکتابه الجامع الصحیح

ان کے علاوہ مولانا علی میاںؒ نے اپنی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت (جو ۶ جلدوں میں

ہے) کی جلد اوّل میں تدوین حدیث‘ محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی‘ فن اسماء الرجال‘ محدثین کی احتیاط و امانت‘ ان کی قوتِ حافظہ اور استحضار وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے‘ جو دراصل تاریخ تدوین حدیث کا خلاصہ و نچوڑ ہے۔

جلد پنجم کے باب ششم میں حدیث کی اہمیت اور ہر ملک اور ہر دَور میں اس کی ضرورت‘ حدیث اُمت کے لیے صحیح میزان و معیار‘ تاریخ اسلام میں اصلاح وتجدید کی تحریکیں علم حدیث سے وابستہ ہیں‘ علم حدیث اور عرب وہندوستان میں علم حدیث کا عروج و زوال جیسے موضوعات پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔

دور الحديث فی تکون المناخ الاسلامی و صیانته

یہ مولانا علی میاں کی عربی تالیف ہے‘ جس کا اردو ترجمہ ’’اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل و حفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار‘‘ کیا ہے اور انگریزی ترجمہ:

"ROLE OF HADITH IN THE PROMOTION OF ISLAMIC CLIMATE AND ATTITUDES."

کے نام سے کیا ہے۔ اردو اور انگریزی ایڈیشن مجلس نشریات اسلام لکھنؤ اور کراچی سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس رسالہ میں مولانا علی میاںؒ نے ایک نئے زاویہ اور ایک نئے اسلوب کے ساتھ یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ:

> ’’حدیث مسلمانوں کی زندگی میں کیا مقام رکھتی ہے۔ اُمت کو سنت کی کس قدر ضرورت ہے‘ اور اس اُمت کے سنت مطہرہ سے رشتہ منقطع ہو جانے اور حدیث نبویؐ کے سرمایہ سے محروم ہو جانے میں اُمت کا کتنا بڑا خسارہ اور وجودِ اسلامی کے لیے کتنا بڑا خطرہ مضمر ہے۔ حدیث کے سند و حجت ہونے کے بارے میں شک وشبہ و بے اعتمادی پیدا کرنے کی عالمِ اسلام کے بعض گوشوں میں جو تحریک چل رہی ہے وہ اسلام کے خلاف کتنی گہری اور خطرناک سازش ہے اور اس کے پیچھے کون سے مقاصد و محرکات سرگرم عمل ہیں۔‘‘ (صفحہ ٦)

مجلس نشریاتِ اسلام کراچی نے ۱۹۸۲ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع کیا۔ اس کے صفحات کی تعداد ۴۵ ہے۔ مولانا علی میاںؒ نے درج ذیل عنوانات کے تحت علم حدیث کی تاریخ پر بحث کی ہے:

(۱) بعثتِ محمدیؐ کے مقاصد اور شعبہ ہائے چہارگانہ۔

(۲) وہ عناصر وعوامل جنہوں نے صحیح اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل کی۔
(۳) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اسلامی زندگی میں ذوقِ مشاہدہ اور صحبت کا حصہ۔
(۴) قرآنی اخلاق۔
(۵) احکام پر بسہولت عمل کرنے کے لیے مناسب ماحول اور سازگار فضا کی ضرورت۔
(۶) قدیم مذاہب نے کس طرح اپنے انبیاء علیہم السلام کے صحیح احوال واقوال کو گم کر دیا۔
(۷) خلا کو پر کرنے کی کوشش اور بزرگوں کی حکایات وملفوظات کے مجموعے۔
(۸) انبیائے سابقین کی سیرتوں اور حدیث وسیرت نبوی کا ایک سرسری موازنہ۔
(۹) کتب حدیث وسیرت کی صحت واستناد اور ان کی جامعیت واحتواء۔
(۱۰) حدیث' مسلمانوں کی مستند زندگی کے معیار ومیزان کی حیثیت سے۔

اس کے تحت مولانا علی میاں فرماتے ہیں:

''حدیث نبوی ایک ایسی صحیح میزان ہے جس میں ہر دور کے مصلحین ومجددین اس اُمت کے اعمال وعقائد' رجحانات وخیالات کو تول سکتے ہیں اور اُمت کے طویل تاریخی وعالمی سفر میں پیش آنے والے تغیرات وانحرافات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اخلاق و اعمال میں کامل اعتدال وتوازن اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک قرآن وحدیث کو بیک وقت سامنے نہ رکھا جائے۔ اگر حدیث نبوی کا وہ ذخیرہ نہ ہوتا جو معتدل' کامل و متوازن زندگی کی صحیح نمائندگی کرتا ہے' اور وہ حکیمانہ نبوی تعلیمات نہ ہوتیں' اور یہ احکام نہ ہوتے جن کی پابندی رسول اللہ ﷺ نے اسلامی معاشرہ سے کرائی' تو یہ اُمت افراط وتفریط کا شکار ہوکر رہ جاتی اور اس کا توازن برقرار نہ رہتا' اور وہ عملی مثال نہ موجود رہتی جس کی اقتداء کرنے کی خدا تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں ترغیب دی ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(الاحزاب:۲۱)

''یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ) کی ذات میں اُسوۂ حسنہ ہے''۔

اور یہ فرما کر آپ ؐ کے اتباع کی دعوت دی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ (آل عمران:۳۱)

''آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا''۔

یہ ایک ایسا عملی نمونہ ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے اور جس سے وہ زندگی اور قوت و

اعتماد حاصل کر سکتا ہے اور یہ اطمینان کر سکتا ہے کہ دینی احکام کا زندگی پر نفاذ نہ صرف آسان بلکہ ایک امر واقعہ ہے''۔ (صفحہ ۲۹۔۳۰)

(۱۱) حدیث احتساب کا ایک طاقتور ذریعہ اور مصلحین ومجددین اُمت کی ایک تربیت گاہ۔

اس کے تحت مولانا علی میاں لکھتے ہیں:

''حدیثِ نبوی زندگی' قوت اور اثر انگیزی سے بھر پور ہے اور ہمیشہ اصلاح وتجدید کے کام' فساد اور خرابیوں کے خلاف صف آرا اور برسر جنگ ہونے اور معاشرہ کا احتساب کرنے پر ابھارتی رہی ہے' اور اس کے اثر سے ہر دور اور ہر ملک میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اصلاح وتجدید کا جھنڈا بلند کیا' کفن بردوش ہو کر میدان میں آئے' اور بدعتوں' خرافات اور جاہلی عادتوں سے کھلی جنگ کی اور دین خالص اور صحیح اسلام کی دعوت دی۔ اس لیے حدیث نبوی اُمتِ اسلامیہ کے لیے ایک ناگزیر حقیقت اور اس کے وجود کے لیے ایک لازمی شرط ہے اور اس کی حفاظت' ترتیب وتدوین' حفظ اور نشر واشاعت کے بغیر اُمت کا یہ دینی وذہنی اور عملی واخلاقی دوام وتسلسل برقرار نہیں رہ سکتا تھا''۔ (صفحہ ۳۰)

(۱۲) تاریخ کی معتبر شہادت اور اصلاح وتجدید کی تحریکوں میں حدیث وسنت کا بنیادی حصہ۔

(۱۳) اُمت میں دینی ذوق اور اسلامی مزاج کا تسلسل وتوارث۔

(۱۴) انکارِ حدیث کے نئے محرکات وعوامل۔

اس کے تحت مولانا علی میاں بیان فرماتے ہیں:

''جو لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اُمت اسلامیہ کو اس حیات بخش اور ہدایت وقوت عطا کرنے والے صاف وشفاف سرچشمہ سے (حدیث کے حجت ہونے اور اس کی قدر ومنزلت میں شکوک وشبہات پیدا کر کے) محروم کر دیں اور اس پر سے اُمت کا اعتماد اٹھ جائے' وہ اس عظیم نقصان سے شاید ناواقف ہیں جو اس اُمت کو پہنچا رہے ہیں۔ وہ شاید نہیں جانتے کہ اپنی اس نامحمود کوشش سے وہ اس اُمت کو اپنی میراث سے محروم' اپنے آغاز سے بے تعلق' اپنی اصل سے سرگشتہ وحیران بنا رہے ہیں اور وہ معاملہ کر رہے ہیں جو یہودیت ومسیحیت کے دشمنوں نے یا انقلابِ زمانہ نے ان مذاہب کے ساتھ کیا۔ اگر وہ باہوش وحواس یہ کام انجام دے رہے ہیں تو اس اُمت اور اس دین کا ان سے بڑھ کر کوئی دشمن نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد نئے سرے سے پھر اس دینی ذوق کو وجود بخشنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہ جاتا۔ وہ ذوق جو صحابہ کرام کا امتیاز تھا اور جو رسول

اللہ ﷺ کی براہِ راست صحبت یا اس حدیث پاک کے واسطہ کے بغیر (جو اس عہد کی سچی تصویر' اس عہد کی کیفیات سے مملوٗ اور اس کی عطر بیزیوں سے معطر ہے) پیدا نہیں کیا جا سکتا''۔(صفحہ۴۲'۴۳)

مولانا علی میاں نے مغربی نومسلم فاضل محمد اسد (سابق Leopold Weiss) کی کتاب ''Islam at the Crossroads''(جس کا اردو ترجمہ ''اسلام دوراہے پر'') کے نام سے شائع ہو چکا ہے' کا ایک اقتباس نقل کیا ہے کہ:

''سنت نبوی ہی وہ آئینی ڈھانچہ ہے جس پر اسلام کی عمارت کھڑی ہے' اگر آپ کسی عمارت کا ڈھانچہ ہٹا دیں تو کیا آپ کو اس پر تعجب ہوگا کہ عمارت اس طرح ٹوٹ جائے جس طرح کاغذ کا گھروندا''۔(صفحہ۴۳)

انکارِ حدیث کا اثر اور اتباعِ سنت کی ضرورت اور اس کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لیکن یہ اعلیٰ مقام جو اسلام کو اس حیثیت سے حاصل ہے کہ وہ ایک اخلاقی' عملی' انفرادی اور اجتماعی نظام ہے' اس طریقہ سے (یعنی حدیث اور اتباعِ سنت کی ضرورت کے انکار سے) ٹوٹ کر اور بکھر کر رہ جائے گا''۔ (صفحہ۴۴)

منکرین حدیث نے انکارِ حدیث کے سلسلہ میں کئی قسم کے اعتراضات کیے ہیں اور لوگوں کو حدیث سے دور رکھنے کے سلسلہ میں نئے نئے انکشافات کرتے رہتے ہیں۔ کبھی حدیث کو تاریخ کا درجہ دیتے ہیں۔ کبھی یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ حدیث دین اسلام میں حجت نہیں ہے اور حدیث کو ناقابل اعتبار ٹھہرانے کے لیے شکوک وشبہات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں:

''حدیث کے حجت اور یقینی طور پر قابل اعتبار ہونے کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے اور سنت کے انکار کی دعوت دینے کے مختلف دَوروں میں مختلف پیمانوں پر اور مختلف مذہبی' سیاسی اور شخصی اغراض ومقاصد سے اور شریعت اسلامی کی تنفیذ اور دینی پابندی کی ذمہ داری سے فرار کی خاطر ناعاقبت اندیشانہ کوششوں کے باوجود ہمیشہ سنت کا علَم بلند رہا اور اس کی دعوت جاری رہی۔ اسلامی معاشرہ کا خمیر حدیث پاک سے تیار ہوا ہے' اور اس کے رگ وریشہ میں حدیث سرایت کر چکی ہے اور اس طرح اس کا جزوِ بدن ہو چکی ہے کہ اس کو اسلامی معاشرہ کے جسم سے الگ کرنا اور محض قرآن کی بنیاد پر کوئی نیا مکمل معاشرہ قائم کرنا ممکن نہیں۔ خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَـیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَـیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَـیْهِمْ﴾(النحل:٤٤)
''اور ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا' تاکہ آپ وضاحت کے ساتھ ان لوگوں کے لیے
اس کو بیان کردیں جو اُن کے لیے نازل کیا گیا ہے''۔

حدیثِ نبویؐ کے ساتھ ہمیشہ مطالعہ' فہم و تحقیق اور اس کے مراجع و مآخذ کی نشر و اشاعت اور اس کے مخطوطات و نوادر کی تحقیق و طباعت وغیرہ جیسی مختلف شکلوں میں اہتمام کیا جاتا رہا۔ اور اسلامی معاشرہ کا محاسبہ و جائزہ' دعوت الی الخیر' امر بالمعروف و نہی عن المنکر' بدعتوں اور خرافات کی تردید' مغربی تہذیب کی اندھی تقلید' عقائدی' فکری اور تہذیبی ارتداد اور مغربی تمدن کو اپنی تمام خرابیوں و کمزوریوں اور اسلامی زندگی کے مخالف عادت اور قوانین کے ساتھ اختیار کر لینے پر سخت نکیر کا سلسلہ ہمیشہ جوش و خروش سے اس بنیاد پر قائم رہا کہ سنت کو فیصلہ کن حیثیت حاصل رہی اور احادیث نبویہ کو قرآن کے بعد دوسرا بنیادی ماخذ یقین کیا جاتا رہا۔ اور رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی ہر دور میں حق ثابت ہوتی رہی۔

((لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ ظَاهِرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ کَذٰلِکَ)) (۱)
(میری اُمت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا' ان کی مخالفت کرنے والے انہیں کچھ
نقصان نہ پہنچا سکیں گے' یہاں تک کہ قیامت آ جائے۔)

حدیث کی حجیت میں شکوک و شبہات پیدا کرنے والے اور انکارِ سنت کا علم بلند کرنے والے اس ''چراغِ مصطفوی'' کو اپنی کمزور پھونکوں سے بجھانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْکٰفِرُوْنَ﴾ (الصّف)

ع پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

(حدیث کا بنیادی کردار' ص۴۴'۴۵)

☆ صحیح مسلم' کتاب الامارة' باب قوله لا تزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق ح:٣٥٤٤

جنوبی افریقہ میں سولہ دن

ڈاکٹر عارف رشید

رات کے ڈھائی بج چکے ہیں ——— ۱۲ جون ۲۰۰۹ءجمعۃ المبارک کی سحر اپنے آخری حصہ میں داخل ہو چکی ہے ——— والد محترم، راقم الحروف اور عبدالغفور (خادم) علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے ڈیپارچر لاؤنج میں Emirate کی فلائٹ 766 کی اناؤنسمنٹ کے منتظر ہیں۔ پونے دو گھنٹے کی تاخیر سے (ساڑھے تین کی بجائے پونے پانچ بجے) پرواز نے ٹیک آف کیا اور یوں ہمارے جنوبی افریقہ کے سفر کا آغاز ہو گیا ——— تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل بھی پروگرام بنا تھا لیکن بانی محترم کی علالتِ طبع کے باعث پروگرام ملتوی کرنا پڑا ——— اب اللہ ہی کی تائید اور نصرت کے بھروسے پر سفر کا آغاز کر دیا۔ پہلی منزل دوبئی تھی، جہاں تقریباً تین گھنٹے انتظار کے بعد اگلے سفر کا آغاز ہوا، جو ۸ گھنٹے کی مسلسل پرواز پر مبنی تھا اور مقامی وقت کے مطابق شام ساڑھے پانچ بجے جوہانس برگ انٹرنیشنل پر اختتام پذیر ہوا ——— ایئرپورٹ پر کم وبیش پندرہ حضرات ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ پارکنگ کی طرف روانہ ہوئے تو شدید ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ——— یہ بات تو ہمیں لاہور ہی میں معلوم ہو گئی تھی کہ جنوبی افریقہ میں موسم سرما کا آغاز مئی کے مہینے سے ہوتا ہے اور اگست تک جاری رہتا ہے۔ گویا پاکستان میں شدید گرمیوں کے دنوں میں وہاں سردی اپنے عروج پر ہوتی ہے ——— یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ظہور ہے۔

ایئرپورٹ لاؤنج سے ابھی باہر بھی آنے نہ پائے تھے کہ ہمارے میزبان محمد علی انجم صاحب نے ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب کی ایک خودکش حملے میں شہادت کی روح فرسا خبر سنا دی۔ پاکستان سے لگ بھگ دس ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر ایئرپورٹ پر لینڈ کرتے ہی اس خبر نے دل کو شدید صدمے کی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ بارہ روز قبل قرآن آڈیٹوریم میں منعقدہ ایک سیمینار میں مولانا موصوف تشریف لائے تھے۔ راقم پہلے ہی مولانا کی سادگی اور درویش منش طبیعت سے متاثر تھا۔ اگرچہ پی ایچ ڈی تھے، لیکن ذاتی سواری کے طور پر اپنی پرانی موٹر سائیکل ہی پر قناعت کیے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیّین میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

ہمیں دورۂ جنوبی افریقہ کے لیے مدعو کرنے والے جناب محمد علی انجم تھے۔ موصوف کا تعلق اگرچہ ڈیرہ غازی خان سے ہے لیکن کراچی میں خاصا عرصہ گزارا، تنظیم اسلامی کے ملتزم رفقاء میں شامل ہیں —— کراچی ہی کی میمن برادری کے ایک نوجوان جناب شعیب اقبال صاحب کی دعوت پر (جو ایک بڑی کاروباری فیملی سے تعلق رکھتے تھے)، جنوبی افریقہ منتقل ہو گئے۔ جناب شعیب اقبال صاحب نے ۲۰۰۲ء میں جوہانس برگ میں ڈیٹرجنٹ پاؤڈر بنانے والی ایک فیکٹری 'MAQ' کا سنگ بنیاد رکھا، جس نے بہت ہی مختصر عرصہ میں مارکیٹ میں اپنی شناخت اور ساکھ بنا لی —— اُس وقت تک ساؤتھ افریقہ میں Unilever برانڈڈ ڈیٹرجنٹ پاؤڈرز ہی معروف تھے —— موصوف اس اعتبار سے بھی لائق صد تشکر ہیں کہ ہماری ساؤتھ افریقہ آمد و رفت کے اخراجات مع ان الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں اشتہارات کے ضمن میں اخراجات، جو محترم ڈاکٹر صاحب کے پروگرام کی تشہیر کے سلسلے میں جاری کیے گئے تھے، موصوف ہی نے برداشت کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کے بہترین اجر سے نوازے۔ جمعہ ہی کی رات کو قبل عشاء ہم جوہانس برگ میں ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے —— لگ بھگ ایک ایکڑ سے زائد پر تعمیر شدہ ان کا بنگلہ ہمارا مسکن ٹھہرا۔ ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ جنوبی افریقہ میں ہمارا قیام ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کے گھر پر رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر کا ایک حصہ جو دو بیڈ رومز اور ایک وسیع لاؤنج پر مشتمل تھا، ہمارے لیے خاص کر دیا گیا تھا۔ جب لاؤنج میں داخل ہوئے تو باہر کی سردی کے مقابلے میں لاؤنج خاصا گرم محسوس ہوا۔ کچھ دیر بعد اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن کوئی ہیٹر نظر نہ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لاؤنج کے فرش کے اندر الیکٹرک راڈز نصب کیے گئے ہیں تاکہ فرش کی گرمی کمرے کو بھی گرم رکھے —— ڈاکٹر طاہر مسعود انستھیزیا کے ماہر ڈاکٹر ہیں۔ تقریباً ۱۷ سال قبل جنوبی افریقہ منتقل ہوئے تھے، پاکستان میں موصوف کا تعلق ساہیوال سے ہے —— راقم الحروف کی جائے پیدائش بھی ساہیوال ہے اور پانچویں کلاس تک کا عرصہ ساہیوال ہی میں گزرا ہے، لہٰذا گفتگو کے دوران تصوراتی دنیا میں وہاں کے گلی محلوں کی خوب سیر کی۔ موصوف زمانۂ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ کے مخلص کارکن تھے اور اب رکنِ جماعت اسلامی ہیں —— ہمارے سولہ روزہ قیام کے دوران موصوف نے جس طرح ہمارا خیال رکھا ہے اور جس محبت اور اپنائیت سے ہمیں نوازا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کو اس کا بہترین اجر و ثواب عطا فرمائے۔

جوہانس برگ، جنوبی افریقہ کا ایک بڑا شہر اور دنیا کے خوبصورت ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ تقریباً ۱۱۰ کلومیٹر قطر کے دائرے پر محیط یہ شہر اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ زیر زمین دنیا بھر کے سونے اور پلاٹینیم کے ذخائر کے اعتبار سے top پر ہے —— میرے اس سوال پر کہ یہاں

بلند و بالا عمارات نظر نہیں آتیں اور ڈاؤن ٹاؤن میں بھی ۲۰'۲۵ منزلہ سے زیادہ بلند عمارت موجود نہیں ہے' ہمارے میزبان جناب ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب نے بتایا کہ یہ شہر زیر زمین بالکل کھوکھلا ہے۔ سونے کے ذخائر کی برآمدگی کے لیے کئی کئی levels پر tunnels کھودی گئی ہیں۔ گوروں کے دورِ حکومت میں بہت بڑی مقدار میں سونا اور پلاٹینیم نکالا گیا اور شہر کو زیر زمین کھوکھلا کر دیا گیا —— ڈاکٹر صاحب کے خطابات کے سلسلہ میں شہر سے باہر مضافات کی طرف جاتے ہوئے جا بجا سنہری رنگ والی مٹی کی پہاڑیاں نظر آئیں۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ سونے کو نکالنے کے پروسس میں زیر زمین مٹی کو نکالنے سے یہ پہاڑیاں وجود میں آ گئیں اور شام کے وقت جب سورج کی کرنیں ان سنہری پہاڑیوں پر پڑتی ہیں تو یہ واقعی سونے ہی کی پہاڑیاں نظر آتی ہیں —— اور جہاں جہاں سے پلاٹینیم برآمد ہوئی وہاں چاندی کی پہاڑیاں وجود میں آ گئیں۔

جوہانس برگ میں بیتے سولہ دنوں میں مضافاتِ شہر کی بہت سی آبادیوں میں جانا ہوا۔ بعض جگہیں تو ہماری رہائش گاہ سے ۷۰'۷۵ کلومیٹر کے فاصلے پر تھیں —— ہر سڑک ہماری موٹروے سے بھی زیادہ چوڑی اور بہتر ہے۔ ۲۰۱۰ء میں چونکہ فٹ بال کا ورلڈ کپ جوہانس برگ میں طے ہے اس لیے تمام سڑکوں کو مزید چوڑا کرنے کا عمل جاری ہے۔ جو سڑکیں تین lanes کی تھیں وہ چار میں' اور جو چار lanes کی تھیں وہ پانچ lanes میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ لیکن مجال ہے کہ کسی سڑک کو مکمل بلاک کیا گیا ہو۔ تعمیر کی وجہ سے lanes کم ہونے کے باعث ٹریفک کا بہاؤ سست تو ہو جاتا ہے لیکن ٹریفک رکتی نہیں ہے۔

۱۳ جون' بروز ہفتہ

آج جوہانس برگ میں ہمارا پہلا دن تھا جو آرام کے لیے رکھا گیا تھا اور آج کے دن کی واحد مصروفیت محترم ڈاکٹر صاحب کا ایک گھنٹہ کا خطاب تھا جو بعد نماز ظہر ہماری رہائش گاہ کے لاؤنج میں ہوا —— بنیادی طور پر یہ ایک تعارفی نشست تھی۔ ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب نے اپنے قریبی احباب اور اعزہ و اقارب کو lunch پر مدعو کیا تھا۔ نمازِ ظہر کی ادائیگی کے بعد بانی محترم کا خطاب بعنوان ''پاکستان کی موجودہ صورتِ حال اور ہماری دینی ذمہ داریاں'' ہوا —— بعدہٗ سوال و جواب کی نشست ہوئی۔ سوات میں حالیہ آرمی ایکشن کے حوالے سے کئی سوالات کیے گئے —— دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ضمن میں انجمن خدام القرآن' تحریک دعوت رجوع الی القرآن' تنظیم اسلامی کی دعوت وغیرہ تمام ہی موضوعات زیر گفتگو آئے —— اسی دوران نماز عصر کا وقت ہو گیا۔ نماز عصر سے فارغ ہو کر 'پرتکلف ظہرانہ' پیش کیا گیا۔ مغرب اور عشاء کے

درمیان انفرادی سوالات کے جوابات کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۴جون' اتوار

آج دن دو بجے ''نانا میموریل سنٹر'' میں' جو ہماری رہائش گاہ سے تقریباً ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے' محترم ڈاکٹر صاحب کا جنوبی افریقہ کے شہر جوہانس برگ میں پہلا ''عوامی خطاب'' تھا ـــــ ''نانا میموریل سنٹر'' ایک بڑے ہال' ملحقہ لان' اور چھوٹے بڑے کئی کمروں پر مشتمل ہے۔ اصلاً یہ ایک چرچ تھا جسے مسلمانوں نے خرید کر اپنے مذہبی فنکشنز کے لیے ایک ہال میں تبدیل کر دیا تھا۔ ہال میں سامعین کے لیے آرام دہ سیٹوں کی بجائے لکڑی کے Benches نصب تھے۔ غالباً 'چرچ' میں یونہی ہوتا ہے۔ ''حقیقت و ماہیت ایمان'' کے موضوع پر ڈیڑھ گھنٹے کا خطاب (بزبانِ انگریزی) ہوا اور بعدہٗ سوال و جواب کی نشست تقریباً آدھ گھنٹے جاری رہی۔ گھر واپس آتے آتے مغرب ہوگئی۔

۱۵جون' سوموار

صبح ناشتے سے فارغ ہوئے تو ''اسلام ٹی وی'' کا عملہ محترم ڈاکٹر صاحب سے انٹرویو کے لیے پہنچ گیا ـــــ گھر کے لاؤنج ہی میں ریکارڈنگ کے لیے بساط بچھائی گئی ـــــ انٹرویو میں ''پاکستان میں مختلف دینی جماعتوں کا کردار'' کے موضوع پر کھل کر گفتگو ہوئی۔ جوہانس برگ کی ایک معروف شخصیت جناب اختر ٹوکن صاحب سے' جو بڑے پیمانے پر کاروبار کر رہے ہیں اور کئی کمپنیوں کے مالک ہیں' کل ملاقات ہوئی تھی۔ موصوف کے پڑدادا تقریباً ۱۲۰ سال قبل انڈیا سے جنوبی افریقہ منتقل ہو گئے تھے ـــــ اس عرصہ کے دوران ٹوکن خاندان کی افرادی قوت بھی خوب پھلی اور پھولی' نتیجتاً خاصی بڑی ٹوکن برادری اب جوہانس برگ میں موجود ہے ـــــ جوہانس برگ میں کئی مساجد بھی اسی برادری نے تعمیر کی ہیں اور ''نانا میموریل سنٹر'' بھی انہی کی ملکیت ہے۔ موصوف چونکہ آئی ٹی وی کے شیئر ہولڈر بھی ہیں' لہٰذا آج کے دونوں انٹرویوز موصوف ہی کی ہدایت پر لیے گئے تھے۔ پہلے انٹرویو کا ذکر اوپر گزر چکا ہے' دوسرے کے لیے جناب عبداللہ دیدات صاحب تشریف لے آئے ـــــ موصوف انتہائی مخلص' دینی ذہن رکھنے والے اور اقبال کے دیوانے ہیں۔ شیخ احمد دیدات کے نام سے آپ حضرات بخوبی واقف ہوں گے' جو عیسائیوں کے ساتھ مناظروں کے حوالے سے بہت معروف ہیں' موصوف ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اقبال کے بعض اشعار quote کرتے ہوئے موصوف کی آنکھوں میں آنسوا منڈ آئے۔ خصوصاً اقبال کے وہ اشعار جن میں قرآن حکیم یا نبی اکرمﷺ کا ذکر مبارک ہے اُن کو تو پڑھتے ہوئے کئی بار

آبدیدہ ہوئے —— جناب عبداللہ دیدات بعد میں محترم ڈاکٹر صاحب کے کئی پروگراموں میں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔

بعد نمازِ عشاء کا پروگرام جوہانس برگ کے مضافات میں سے ایک مقامی آبادی ''روشنی'' کی جامع مسجد میں طے تھا۔ یہ خطاب بھی انگریزی زبان میں تھا اور خطاب کا عنوان تھا ''راہِ نجات'' The Way to Salvation —— بعدۂ حسبِ معمول سوال جواب کی نشست ہوئی —— ''روشنی'' جوہانس برگ کی ایک مضافاتی بستی کا نام ہے جہاں بڑی اکثریت مسلمانوں کی آباد ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کم وبیش ڈیڑھ صدی قبل انڈیا سے منتقل ہوئے تھے۔ اب ان کی تیسری نسل پروان چڑھ رہی ہے —— بستی کے عین وسط میں شاندار مسجد ہے جس کا بڑا گنبد اور اونچا مینار دور ہی سے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے —— نماز کے لیے اذان باقاعدہ لاؤڈ اسپیکرز پر دی جاتی ہے —— ایسی آبادی میں موجود اگر کوئی غیر مسلم اعتراض کرے تو ''فجر کی اذان'' لاؤڈ اسپیکر پر نہیں دی جاتی تاکہ اُن کی نیند میں خلل واقع نہ ہو' لیکن بقیہ اذانیں لاؤڈ اسپیکر پر ہی دی جاتی ہیں —— پروگرام کے بعد ہمارے میزبان جناب ڈاکٹر خالد مقدم صاحب کے گھر پر انتہائی پرتکلف ڈنر کا اہتمام تھا —— گھر واپسی تقریباً ساڑھے گیارہ بجے شب ہوئی۔

۱۶ جون' منگل

پہلے سے طے شدہ پروگرام سے ہٹ کر آج جناب اختر ٹوکن صاحب کے قائم کیے ہوئے ایک ویلفیئر ٹرسٹ کے سالانہ اجتماع میں محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب طے کر لیا گیا۔ ''نانا میموریل سنٹر'' میں محترم ڈاکٹر صاحب نے ''اسلام کا معاشی نظام'' کے موضوع پر انگریزی میں خطاب فرمایا —— بعدۂ سوال جواب کا سیشن ہوا اور آخر میں ملحقہ ہال میں پرتکلف لنچ کا اہتمام تھا —— گھر واپس لوٹتے مغرب ہوگئی۔

آج ہی کی تاریخ میں دوسرا پروگرام (جو پہلے سے طے شدہ تھا) ''مسجد امام شافعی'' میں بعد از عشاء محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب تھا —— یہ عظیم الشان مسجد جس علاقے میں واقع ہے وہاں صومالیہ کے مسلمانوں کی اکثریت رہائش پذیر ہے۔ تقریباً ۳۰۰ کے قریب حضرات جن میں زیادہ تعداد نوجوان صومالی مسلمانوں کی تھی' شریک محفل تھے۔ یہ خطاب بھی انگریزی میں تھا۔ صومالی نوجوانوں کا اسلام کے ساتھ ایک گہرا تعلق ان کے نماز میں خشوع وخضوع سے ظاہر تھا۔ امام مسجد نے جس خلوص اور محبت سے ڈاکٹر صاحب کو دعوتِ خطاب دی تھی' اس سے اُن کا دینی ذوق اور خصوصاً قرآن حکیم کے ساتھ محبت بہت واضح تھی —— آج کے خطاب کا عنوان ''نیکی کی

حقیقت'' تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے خطاب کے بعد تقریباً آدھ گھنٹہ سوال و جواب میں صرف ہوا اور اپنی رہائش گاہ پر رات تقریباً ۱۱ بجے واپسی ہوئی۔

۱۷جون' بدھ

صبح کے اوقات میں بعض حضرات محترم ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی غرض سے تشریف لائے۔ گویا ناشتے کے بعد سے قبل ظہر تک کا دورانیہ اس کام میں صرف ہوا ——— دوپہر کے آرام کے بعد نمازِ مغرب پڑھتے ہی آج کے پروگرام کی تیاری شروع ہوگئی۔ ہماری رہائش گاہ سے تقریباً ۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک پوش آبادی 'Benoni' کی جامع مسجد 'مسجد انصار' میں بعد نماز عشاء محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب ہوا ——— آج کا عنوان ''فرائض دینی کا جامع تصور'' تھا۔ یہ خطاب بھی انگریزی ہی میں ہوا ——— اس مسجد میں ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے لیے خصوصی محنت جناب سردار خان صاحب نے کی تھی ——— موصوف کے بقول ابتداء میں ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے ضمن میں مسجد انتظامیہ تعاون نہیں کر رہی تھی' لیکن بہرحال موصوف کی کوششوں سے نہ صرف خطاب طے ہو گیا' بلکہ اسلام ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے اعلانات بھی کروا دیے گئے ——— نتیجتاً حاضری خاصی تھی۔ سردار خاں صاحب کا تعلق صوبۂ سرحد سے ہے اور موصوف اعلیٰ پیمانے پر کنسٹرکشن کا کام کر رہے ہیں (تقریباً ۲۵ سال قبل جنوبی افریقہ میں منتقل ہوئے تھے) ——— ڈاکٹر صاحب کے لیے سراپا محبت وعقیدت' ——— آخری روز بیعت فارم حاصل کر کے تنظیم اسلامی میں شمولیت بھی اختیار کر لی۔

۱۸جون' جمعرات

صبح ناشتے سے فارغ ہوئے تو ہماری رہائش گاہ کے وسیع لاؤنج میں محترم ڈاکٹر صاحب کا ایک خطاب بعنوان ''احیائے اسلام میں خواتین کا کردار'' طے کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب کے اعزہ واقارب اور احباب کی خواتین کی طرف سے شدید اصرار تھا کہ خواتین کی دینی ذمہ داریاں ان پر واضح کی جائیں اور یہ بھی بتایا جائے کہ جنوبی افریقہ میں رہتے ہوئے وہ اُن ذمہ داریوں کو کیسے ادا کریں ——— صورتِ حال یوں تھی کہ ڈاکٹر صاحب اپنے بیڈ روم میں کرسی پر تشریف فرما تھے۔ دروازے کے سامنے ایک پردہ آویزاں تھا اور اُس کے عقب میں خواتین موجود تھیں ——— ڈاکٹر صاحب کا تفصیلی خطاب ہوا اور بعد میں سوال و جواب کی نشست بھی ہوئی ——— لاؤنج میں موجود بہت سی خواتین جماعت اسلامی سے متأثر تھیں' لہٰذا پاکستان کی سیاست میں جماعت اسلامی کا کردار بھی سوالات کا موضوع رہا ———!

نمازِ عشاء کے بعد جوہانس برگ کے مضافات میں تقریباً ۷۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک آبادی ''سپرنگ ٹاؤن'' کی مسجد میں محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب طے تھا —— فاصلہ چونکہ زیادہ تھا اور راستے میں ٹریفک بلاک کا بھی اندیشہ تھا' لہٰذا مغرب پڑھتے ہی روانہ ہو گئے۔ اس آبادی میں ہمارے میزبان جناب عبدالصمد خان صاحب تھے۔ موصوف کے پڑدادا کم وبیش ایک صدی قبل بھارت سے جنوبی افریقہ منتقل ہوئے اور آج اُن کی تیسری نسل پروان چڑھ رہی ہے —— ڈاکٹر صاحب کے آج کے خطاب کا عنوان ''نبی اکرمﷺ کا مقصد بعثت'' تھا اور یہ خطاب بھی انگریزی ہی میں تھا۔ رہائش گاہ تک پہنچتے پہنچتے حسب معمول رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔

۱۹ جون' جمعۃ المبارک

ناشتے سے فارغ ہوتے ہوتے صبح کے دس بج چکے تھے اور ساڑھے بارہ بجے خطابِ جمعہ کے لیے ہمیں ۲۰ کلومیٹر پر واقع ہاؤٹن (Houghton) پہنچنا تھا۔ اس جگہ ابھی مسجد تعمیر نہیں ہوئی تھی' صرف ایک زگ زیگ شکل کا ہال تھا — امام مسجد سیاہ فام صومالی تھے۔ بڑے تپاک سے ملے اور خطاب سے قبل بہت محبت بھرے انداز میں ڈاکٹر صاحب کا تفصیلی تعارف کرایا۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے تقریباً آدھ گھنٹے ''حکمت واحکامِ جمعہ'' کے موضوع پر انگریزی میں خطاب فرمایا —— خطابِ جمعہ سے فارغ ہوکر جناب شعیب اقبال صاحب کے گھر پر' جو ہمارے دورۂ افریقہ کے sponsor تھے اور جن کا تعارف میں ابتدا میں کرا چکا ہوں' پرتکلف ظہرانہ کا اہتمام تھا۔

بعد نماز عشاء Boston کی جامع مسجد میں ڈاکٹر صاحب کا خطاب طے تھا۔ یہاں کے امام مسجد بھی صومالیہ کے سیاہ فام تھے۔ نمازِ عشاء میں بہت خوبصورت تلاوت کی۔ ایک خاص بات جو اُن کے ہاں دیکھنے میں آئی' وہ یہ کہ سلام پھیرتے ہوئے دائیں جانب اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ کہتے تھے اور بائیں جانب صرف اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ پر اکتفا کرتے تھے —— شاید یہ اس بنیاد پر ہو کہ نیکیوں کے لکھنے والے فرشتے کے احترام میں خصوصی اضافہ کرتے ہوئے وَبَرَکَاتُہٗ کے الفاظ بڑھا دیے جاتے ہوں۔ آج کے خطاب کا عنوان ''ختم نبوت کے تقاضے'' تھا' جو حسبِ سابق ڈیڑھ گھنٹے پر محیط اور انگریزی زبان میں تھا۔

۲۰ جون' ہفتہ

آج کے لیے واحد پروگرام دن کے وسط میں یعنی ڈھائی بجے دوپہر' نانا میموریل سنٹر' میں طے تھا۔ خطاب کا عنوان ''نبی اکرمﷺ کی بعثت کی امتیازی شان'' تھا۔ پونے دو گھنٹے کا خطاب

اور نصف گھنٹہ سوال و جواب کی نشست میں صرف ہوا —— ڈاکٹر صاحب کے خطابات میں جو مجمع (gathering) ڈاکٹر ذاکر نائیک کے ادارے کے زیر اہتمام ممبئی میں ہونے والے پروگراموں میں دیکھنے میں آتا تھا' یہاں جوہانس برگ میں اس کی کسی جھلک کا کوئی امکان نہ تھا۔ جو لوگ بھی یہاں جوہانس برگ کے پروگراموں میں شریک ہوتے رہے اوسطاً تیس تا پچاس کلومیٹر کے فاصلے سے آتے تھے —— نانا میموریل سنٹر کے قرب و جوار میں کوئی مسلم آبادی موجود نہ تھی' لہٰذا تعداد (quantity) تو کم رہی لیکن معیار (quality) قائم رہا۔ تمام شرکاء پڑھے لکھے' ڈاکٹرز' انجینئرز' ٹریڈرز' طلبہ اور خصوصاً جماعت اسلامی کے حلقے کے بہت سے افراد شریکِ مجلس رہے۔ نانا میموریل سنٹر سے فارغ ہو کر ڈاکٹر کاشف مصطفیٰ کے گھر پر Dinner تھا —— ڈاکٹر صاحب موصوف نے برادرم انجم کے ساتھ مل کر ڈاکٹر صاحب کے جوہانس برگ کے پروگراموں کی ترتیب اور اہتمام میں خاصا کام کیا تھا۔ لوگوں سے فون کے ذریعے رابطے' ہزاروں کی تعداد میں ای میلز کے ذریعے مسلمانانِ جوہانس برگ کو پروگراموں کی اطلاع' Leaf-lets کی طباعت اور اس کی تقسیم وغیرہ وغیرہ —— ڈاکٹر صاحب موصوف کا راولپنڈی/اسلام آباد سے تعلق ہے اور کم و بیش پندرہ سال سے ''کارڈیک سرجن'' کے طور پر مختلف ہسپتالوں میں کام کر رہے ہیں۔

۲۱ جون' اتوار

آج کے دن کی واحد مصروفیت بھی کل کی طرح ''نانا میموریل سنٹر'' میں مرکزی خطاب تھا۔ دو پہر ڈھائی بجے ''اسلامی انقلاب کے لیے ناگزیر مراحل'' کے موضوع پر دو گھنٹے کا خطاب (بزبان انگریزی) ہوا —— سوال و جواب کی بھی مفصل نشست ہوئی۔ نمازِ عصر اور مغرب وہیں ادا کیں اور قبل عشاء اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ آج کا خطاب بہت پُرتاثیر تھا۔ دورانِ خطاب سامعین کی آنکھیں کئی بار اشکبار ہوئیں' خصوصاً انقلابِ محمدیﷺ کے مراحل کے بیان میں —— سامعین کے لیے غالباً یہ باتیں بالکل نئی تھیں' اس لیے کہ اکثر و بیشتر سیرتِ محمدیﷺ کا بیان ہوتا بھی ہے تو حضورﷺ کے مناقب' درجات' صحابہ کی حضورﷺ سے محبت' معجزات اور کرامات کے ظہور وغیرہ کا' جبکہ آج جو باتیں سامنے آئیں تو اس میں تصویر کا دوسرا رخ دکھایا گیا' جس میں شعب ابی طالب کی سختیاں' طائف کے سفر کے مصائب' غزواتِ بدر' اُحد' احزاب —— آپﷺ کے قریب ترین ساتھیوں کی جانوں کا نذرانہ' اور خود آپؐ کے چہرۂ مبارک کا خون سے رنگین ہو جانا وغیرہ شامل تھے۔

۲۲جون، سوموار

آج کے دن کا نصف اوّل جوہانس برگ کے بعض مقامات کی ''سیر'' کے لیے طے تھا۔ ڈاکٹر کاشف نے دوپہر کے لیے سینڈوچز، کباب، پیزا وغیرہ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ سفاری پارک کی سیر کا پروگرام طے کر لیا گیا تھا —— دوپہر کا وقت غالباً جانوروں کے آرام کا تھا، اس لیے کوئی جانور نظر نہیں آیا —— پارک کے Exit کے قریب ایک ببر شیر اپنی چار عدد 'ازواج' کے ساتھ ایک درخت کے سائے تلے آرام کرتا نظر آیا —— ہماری گاڑی اپنے قریب دیکھ کر خونخوار آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، لیکن چاروں شیرنیاں اپنے اپنے بچوں کے ساتھ مصروف رہیں —— پارک کے کیفے ایریا میں گاڑیوں سے اترے اور ناشتے کے سامان کے ساتھ زمین پر چادریں بچھا کر براجمان ہو گئے۔ قریب ہی تین شترمرغ چہل قدمی کر رہے تھے، ان میں سے ایک جو بہت قدآور اور غالباً dominant male تھا، اپنی گردن نیچی کر کے ہماری طرف رخ کرنے لگا۔ ہم جو چادروں پر براجمان تھے اٹھ کر بھاگ گئے، لیکن محترم ڈاکٹر صاحب کرسی پر تھے، وہ وہیں بیٹھے رہے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے انتہائی محنت سے تیار کیے ہوئے سینڈوچز کھانے لگ گیا۔ ہمارے ساتھی لاہور کے بٹ صاحب نے ہمت کی اور اپنے ہاتھ میں ایک بڑا سا کپڑا لے کر ان کو بھگانے کی کوشش کرنے لگے —— لیکن ان کو سینڈوچز کا چٹخارہ لگ چکا تھا —— ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب نے اپنی پراڈو اسٹارٹ کی اور ان کو ڈرانے کی غرض سے ان کی طرف بڑھے۔ اس پر وہ شترمرغ ہمارا پیچھا چھوڑ کر چلے گئے —— لنچ کا جو حصہ بچ گیا تھا اس پر ہم نے گزارا کیا۔ ایک دو مرتبہ انہوں نے دوبارہ ہماری طرف بڑھنے کی کوشش کی، لیکن اُن کو بھگانے میں پھر ڈاکٹر طاہر صاحب کی پراڈو کام آئی۔ تینوں شترمرغ کچھ فاصلہ پر کھڑے ہو کر ہمارے جانے کا انتظار کرنے لگے کہ آخر ہمارا بچا کھچا ان ہی کے کام آئے گا۔

بعد نمازِ عشاء ''صابری مسجد'' Lanasia میں محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب تھا، جس میں سورۃ الصّف کی تین مرکزی آیات کو موضوعِ سخن بنایا اور نبی اکرمﷺ کی بعثت کی امتیازی شان پر مفصل گفتگو کی۔ یہ خطاب بھی ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا اور نصف گھنٹے کے سوال و جواب کی نشست کے بعد تقریباً ۴۰ کلومیٹر کا سفر طے کر کے رات گیارہ بجے گھر پہنچ گئے۔

۲۳جون، منگل

آج کے دن کا نصف اوّل بھی کل کی طرح جوہانس برگ کے نواح میں واقع ایک مقام Cradle of Humankind کی سیر کے لیے طے تھا۔ علم حیاتیات کے ماہرین کے نزدیک

انسان کی زندگی کا آغاز کرۂ ارضی کے اس معین مقام سے ہوا تھا ——— داخلے کے لیے خاصا مہنگا ٹکٹ تھا۔ آج کے لیے ہمارے میزبان ڈاکٹر فیاض حمید تھے۔ موصوف جماعتِ اسلامی کے ارکان میں شامل ہیں، انتہائی مخلص، محبت کرنے والے نوجوان ہیں ——— ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں سے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے جنرل سرجن ہیں اور تقریباً ۱۶، ۱۷ سال سے جنوبی افریقہ میں مقیم ہیں ——— سیرگاہ چارمنزلہ عمارت پر مشتمل ہے۔ تصاویر اور ماڈل کے ذریعے دکھایا گیا ہے کہ اس زمین پر زندگی کا آغاز کب اور کیسے ہوا تھا اور بالآخر ''حضرت انسان'' نے بندر سے انسان بننے کے مرحلے کو کب سر کیا تھا۔

ے کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارِون بولا بوزنا ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست!

اس سیر گاہ میں ایک ride بھی تھی، جس کے دروازے پر لکھا تھا کہ کمزور دل حضرات، بلڈ پریشر یا دل کے مریض، اینگزائیٹی کے مریض اس میں نہ بیٹھیں، اور اگر بیٹھیں تو اپنے رسک پر۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اصرار کیا کہ وہ ضرور بیٹھیں گے۔ وہیل چیئر سے اٹھ کر اس ride میں بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن نہ مانے ——— گھٹنے کی معذوری آڑے آئی۔ جب گھٹنا اونچا کر کے رائڈ میں سوار ہونے کی کوشش کی تو شدید تکلیف محسوس ہوئی، نتیجتاً اس ride میں سوار نہ ہو سکے۔ راقم، برادرم انجم اور عبدالغفور اس رائڈ میں سوار ہو گئے۔ گھپ اندھیرے میں رائڈ کا سفر شروع ہوا۔ ساؤنڈ اینڈ لائٹ کے ذریعے اس کائنات کے آغاز یعنی Big Bang کو دکھایا گیا۔ پھر لاکھوں سال کی بارش کا تجربہ کرایا گیا۔ پھر زندگی کا آغاز اور آخر کار ''حضرت انسان'' کا وجود۔ کل سات آٹھ منٹ کی رائڈ میں گویا لاکھوں برس کا سفر طے ہو گیا۔

آج محترم ڈاکٹر صاحب کا کوئی عمومی خطاب نہیں تھا، بلکہ بعد نماز عصر لگ بھگ ۲۲ ڈاکٹرز کے ساتھ ایک نشست تھی، جو صرف سوال و جواب تک محدود رہی ——— جن جن ڈاکٹر حضرات سے ہماری خصوصی محبت کا رشتہ قائم ہوا ان میں سے ڈاکٹر اللہ دتہ (انستھیزیا)، ڈاکٹر فیاض حمید (جنرل سرجن)، ڈاکٹر شبیر شاہ (ماہر امراض چشم)، ڈاکٹر ہارون عباسی (ماہر امراض دل)، ڈاکٹر عامر رؤف (ریڈیالوجسٹ)، ڈاکٹر کاشف مصطفیٰ (کارڈیک سرجن) ڈاکٹر ملک گلزار (ماہر امراض کینسر) آج کے اجتماع میں بطور خاص مدعو تھے، اور عشائیہ کا اہتمام ان ہی ڈاکٹرز میں سے چند حضرات کی

جانب سے تھا۔ نمازعصر کے بعد سے شروع ہو کر یہ نشست رات ۱۰ بجے تک جاری رہی۔

۲۴ جون' بدھ

آج صبح ناشتے کے بعد سے نماز ظہر تک کا دورانیہ مختلف افراد سے ملاقات کے لیے طے تھا —— خاصی مصروفیت رہی' دوپہر میں آرام کیا اور پھر مغرب کی نماز کے بعد Petoria کی جامع مسجد کا رُخ کیا جہاں بعدعشاء ''عبادتِ ربّ'' کے موضوع پر ڈیڑھ گھنٹے کا خطاب ہوا اور بعدۂ حسب معمول سوال و جواب کی نشست —— ڈنر کے بعد حسب سابق ساڑھے گیارہ بجے واپسی ہوئی۔

۲۵ جون' جمعرات

آج بعدعشاء کا ایک پروگرام طے تھا' لیکن ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کی خرابی کے باعث کینسل کر دیا گیا —— دن کے اوقات میں ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ دو مختلف آبادیوں کی جامع مساجد کے خطیب و امام خصوصی ملاقات کے لیے تشریف لائے اور جنوبی افریقہ میں احیائے اسلام کے لیے کی جانے والی کوششوں اور ان کے نتائج اور بعض مقامی مسائل پر سیر حاصل گفتگو ہوئی —— ڈاکٹر صاحب نے اپنے بعض کتابچے ان دونوں علماء کی خدمت میں پیش کیے۔

آج کی رات ہمارے میزبان جناب ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب اور ڈاکٹر فیاض حمید صاحب نے 'Brai' (بَرائی) کا اہتمام کر رکھا تھا جو ہمارے ہاں Bar-B-Q کہلاتا ہے —— بار بی کیو کے لیے جو گوشت وہ لے کر آئے تھے وہ اتنا زیادہ تھا کہ میرے خیال میں ۲۰' ۲۵ آدمیوں کے لیے کافی ہوتا —— میں نے تعجب کا اظہار کیا کہ ہم ۷'۸ افراد کے لیے اتنا زیادہ گوشت؟ ہمارے میزبان کہنے لگے کہ دیکھتے جائیں کہ یہ گوشت کس قدر تیزی کے ساتھ ہمارے معدوں کی گہرائیوں میں اتر جائے گا —— اور واقعتاً آخر میں وہ گوشت منظر سے غائب ہو چکا تھا۔ چلیے! اس تذکرہ کے بہانے آپ بھی ہمارے ساتھ ''بَرائی'' (Brai) میں شریک ہو گئے!!

۲۶ جون' جمعۃ المبارک

صُبح ناشتے سے فارغ ہو کر تھوڑا آرام کیا' پھر جمعہ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ Brixton کی جامع مسجد میں خطابِ جمعہ کا پروگرام تھا —— ایک روز قبل شدید سردی کی لہر آئی تھی اور کم ازکم درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی نیچے چلا گیا تھا۔ لہٰذا مسجد میں نمازیوں کی کمی بھی محسوس ہوئی۔ خطابِ جمعہ کے بعد اختر ٹوکن صاحب کے گھر پر تکلف لنچ کیا۔ ڈاکٹر ٹوکن کی برادری کی خاصی بڑی تعداد اس لنچ میں موجود تھی —— دورانِ لنچ اور بعد میں بھی مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی

رہی۔آج کا دوسرا پروگرام اسی مسجد میں بعد نمازِ عشاء ڈاکٹر صاحب کے خطاب پر مشتمل تھا۔شدید سردی کی وجہ سے حاضری بہت کم تھی۔''حقیقت جہاد'' کے موضوع پر مختصر خطاب ہوا۔

۲۷ جون' ہفتہ

جوہانس برگ کے معروف پاکستانی جنرل سرجن ڈاکٹر خالد مرزا صاحب نے اپنے گھر پر بہت سے احباب کو محترم ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی غرض سے مدعو کر رکھا تھا۔دوپہر ۱۲ بجے وہاں پہنچ گئے' بھرپور Brunch سے مستفید ہوئے۔Brunch کی اصطلاح اصلاً Breakfast اور Lunch کو جمع کر کے وضع کی گئی ہے' گویا ایسا کھانا (meal) جس میں ناشتے اور دوپہر کے کھانے' دونوں کی صفات جمع ہوں۔لہٰذا ناشتے کا قائم مقام' حلوہ پوری' چنے' لسی' اور دوپہر کے کھانے کے طور پر بریانی' مٹن قورمہ' سیخ کباب وغیرہ بھی موجود تھے۔نمازِ ظہر پڑھ کر ''نانا میموریل سنٹر'' کے لیے روانہ ہوئے جہاں آج اردو زبان میں پہلا عوامی خطاب طے تھا۔آج کا موضوع تھا ''دین میں اجتماعیت کی اہمیت''۔سامعین پر خوب واضح ہو گیا کہ جس طرح مادی دنیا میں کوئی بھی نتیجہ خیز کام بغیر اجتماعی جدوجہد کے ممکن نہیں اسی طرح دینی معاملات میں بھی اجتماعیت کے بغیر کسی نتیجہ خیز کام کا انجام تک پہنچ جانا ممکن نہیں ہے ——!!

نماز مغرب سے فارغ ہو کر ہماری رہائش گاہ کے وسیع لاؤنج میں کم و بیش ۳۵ افراد' جو دو ہفتوں سے محترم ڈاکٹر صاحب کے مختلف پروگراموں میں شریک ہوتے رہے' شریک محفل تھے۔بانی محترم نے تقریباً ایک گھنٹہ کے خطاب میں تنظیم اسلامی کی دعوت پیش کی اور دین کے لیے کام کرنے والی دوسری جماعتوں کے طریق کار پر بھی روشنی ڈالی —— برادرم انجم نے ۲۵ کی تعداد میں بیعت فارم مع کوائف فارم پہلے سے تیار رکھے تھے۔بہت سے حضرات نے تنظیم کے کام میں دلچسپی ظاہر کی اور فارم حاصل کیے۔بعض نے وہیں موقع پر پُر کر کے واپس کر دیے۔اس طرح جوہانس برگ میں بھی تنظیم اسلامی کا ایک اسرہ قائم ہو گیا' فَلِلّٰہِ الْحَمْد۔ پروگرام کا اختتام جناب انجم صاحب کی 'ون ڈش بریانی' پر ہوا۔

۲۸ جون' اتوار

صبح ۱۱ بجے نانا میموریل سنٹر میں محترم ڈاکٹر صاحب نے ''سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی' حال اور مستقبل'' کے موضوع پر دو گھنٹے پر محیط خطاب فرمایا۔آج ہی ہماری واپسی کے لیے روانگی ہے' اور رات دس بجے کی پرواز سے ہمیں براستہ دوبئی لاہور کے لیے روانہ ہونا ہے۔نمازِ عشاء پڑھ کر اپنی رہائش گاہ سے روانہ ہوئے۔بہت سے احباب ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب کے گھر

الوداعی ملاقات کے لیے حاضر ہو گئے۔ ان میں سے بعض ایئر پورٹ تک چھوڑنے آئے۔ ایئر پورٹ پر الوداع کہنے والوں میں جناب ڈاکٹر فیاض حمید صاحب' ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب' آصف بھٹو صاحب' جناب شعیب اقبال صاحب' سردار خاں صاحب' جناب طارق صاحب' جناب عرفان صاحب اور برادرم عثمان موجود تھے۔ آصف بھٹو صاحب تو ہمیں گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیے اور دوسروں کو بھی اشکبار کر دیا —— جوہانس برگ میں گزرے سولہ دنوں کی شیریں یادیں اور تمام احباب کی محبتیں اور چاہتیں لیے ہم تینوں (والد محترم' راقم اور عبدالغفور خادم) ایئر پورٹ لاؤنج میں داخل ہو گئے۔ رات گیارہ بجے طیارہ فضا میں بلند ہوا۔ آٹھ گھنٹے کی پرواز کے بعد ۲۹ جون کو مقامی وقت کے مطابق صبح ۸ بجے دوبئی ایئر پورٹ پہنچ گئے —— ایئر پورٹ کے اندر ہی واقع دوبئی انٹرنیشنل ہوٹل میں ۱۱ گھنٹے انتظار کے بعد مقامی وقت کے مطابق رات گیارہ بجے ہمارا طیارہ لاہور کے لیے فضا میں بلند ہو گیا اور ۳۰ جون کی صبح ساڑھے تین بجے لاہور ایئر پورٹ پر لینڈ کر گیا۔ لاہور سے جوہانس برگ ہم اُسی دن یعنی ۱۲ جون کو صبح ۵ بجے روانہ ہو کر شام پانچ بجے منزلِ مقصود پر پہنچ گئے تھے' اور واپسی کے سفر میں تین تاریخیں تبدیل ہوئیں' یعنی ۲۸ کی رات ۱۰ بجے روانہ ہو کر ۳۰ کی صبح ساڑھے تین بجے لاہور پہنچے —— **فَلِلّٰہِ الحَمد وَلَهُ الشّکر !!**

واقعہ یہ ہے کہ جوہانس برگ میں برادرم ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب کے ہاں ہمیں گھر سے بڑھ کر آرام ملا' لیکن اس ظاہری آرام کے ساتھ ساتھ ان کی محبت' اپنائیت اور برادرانہ تعلق نے ہمارے قیام کو دو آتشہ کر دیا اور سولہ دن پلک جھپکتے گزر گئے —— اللہ تعالیٰ اُنہیں اس کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔ (آمین)

مَنۡ لَم یشکُر الناسَ لَا یشکُرُ اللّٰہ کے مصداق بہت ناشکری ہو گی اگر میں برادرم عثمان کا ذکر نہ کروں' جنہوں نے ایک دن آفس سے چھٹی لے کر مجھے ڈاؤن ٹاؤن اور دیگر مقامات کی سیر کرائی۔ موصوف ڈاکٹر طاہر مسعود کی اہلیہ کے بھانجے ہیں اور ایک معروف سیلولر کمپنی میں اونچے عہدے پر کام کر رہے ہیں۔ گوروں کے ڈاؤن ٹاؤن میں واقع ''نیلسن منڈیلا اسکوائر'' ایک اہم ٹورسٹ ریزورٹ ہے —— تقریباً پچاس فٹ بلند کانسی کا بنا ہوا نیلسن منڈیلا کا مجسمہ فائیو سٹار ہوٹلز اور شاپنگ مال کے جھرمٹ میں نصب کیا گیا ہے۔ جنوبی افریقہ کے کالوں (Blacks) کے نزدیک نیلسن منڈیلا کی حیثیت ایک ''دیوتا'' کی سی ہے' جس نے ایک نجات دہندہ بن کر اُنہیں گوروں کے ظلم وستم اور غلامی سے نجات دلائی —— اسی طرح برادرم عثمان نے قریب ہی واقع 'مونٹی کیسینو' کی ایک جھلک بھی دکھا دی جہاں جوئے کے شائقین دنیا و مافیہا سے بے خبر انتہائی انہماک کے ساتھ جوا کھیل رہے تھے اور اپنی ٹینشن کم کرنے کے لیے ''انگور کی بیٹی'' (شراب) سے

شغل فرما رہے تھے —— لگے ہاتھوں برادرم عثمان نے Lion & Hyena Park کا بھی ایک وزٹ کرا ڈالا۔ Hyena اردو زبان میں لگڑ بگڑ کہلاتا ہے۔ شکلاً انتہائی مکروہ واقع ہوا ہے اور خونخوار اتنا کہ اگر شیر کے راستے میں چار پانچ لگڑ بگڑ آ جائیں تو وہ جان بچا کر بھاگنے ہی میں عافیت جانتا ہے۔ اس پارک میں سفاری کا ماحول پیدا کیا گیا ہے۔ آپ اپنی گاڑی ہی میں سوار رہتے ہیں اور شیروں کی مختلف 'states' میں داخل ہوتے ہیں —— اگر شیر چاہے تو آپ کی گاڑی کی چھت یا بونٹ پر بھی چڑھ سکتا ہے۔ ہر سٹیٹ میں ایک ببر شیر اور دو یا تین شیرنیاں اپنے cubs کے ساتھ رہائش پذیر ہوتی ہیں۔ برادرم عثمان نے بتایا کہ بعض اوقات غصے کی حالت میں یہ شیر گاڑی کے ٹائروں کو اپنے دانتوں سے چبا ڈالتے ہیں۔ لہٰذا پہلے سے متنبہ کر دیا گیا کہ شیروں کے قریب جا کر الٹی سیدھی حرکتیں نہ کریں کہ 'شیر بہادر' غصے میں آ جائے اور گاڑی کے ٹائروں کو چبا جائے یا گاڑی کے سواروں کو نقصان پہنچائے۔

اسی طرح حد درجہ ناشکری ہوگی اگر میں برادرم محمد علی انجم صاحب کے ایثارِ وقت کا ذکر نہ کروں۔ ساؤتھ افریقہ میں سولہ دن جس طرح صبح وشام (روزانہ صبح دس' ساڑھے دس بجے سے لے کر رات گئے تک) ہمارے ساتھ ''منسلک'' رہے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو اس سعی وجہد کا بہترین اجروثواب عطا فرمائے —— اور ساتھ ہی جناب شعیب اقبال صاحب کے لیے بھی حد درجہ تشکر جنہوں نے نہ صرف یہ کہ برادرم انجم کو ہمارے لیے ان کی دفتری مصروفیات سے فارغ رکھا بلکہ سولہ دنوں کے لیے اپنی ذاتی نئی مرسڈیز کار بھی ہمارے استعمال کے لیے فراہم کیے رکھی۔

❁❁❁

تصحیح

(۱) گزشتہ شمارے (ماہِ جولائی) میں پروفیسر محمد یونس جنجوعہ کے مضمون ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت وکردار'' میں صفحہ 81 پر محمد بن ابی بکرؓ کے بارے میں یہ جملہ غلطی سے شامل تحریر ہوگیا تھا: ''جو تاریخ میں محمد بن حنفیہ کے نام سے مشہور ہے''۔ یہ جملہ محذوف سمجھا جائے۔

(۲) گزشتہ شمارے ہی میں عطاء الرحمٰن عارف کے سفر بنگلہ دیش کے احوال میں صفحہ 86 پر قاری عبدالرحمٰن صاحب کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ انہوں نے بیس سال ''جامع مسجد شادمان کالونی لاہور'' میں امامت کی تھی' جبکہ یہاں ''جامع مسجد شادمان ٹاؤن کراچی'' ہونا چاہیے تھا۔

ادارۂ میثاق ان دونوں غلطیوں پر معذرت خواہ ہے۔